دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

شمارہ: ۲	صفر ۱۴۳۰ھ مطابق فروری ۲۰۰۹ء	جلد: ۹۳

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپے، سالانہ -/۱۵۰ روپے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۰۰۰ روپے

بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

ہمارا ملک ہندوستان آئین و دستور کی رو سے ایک سیکولر جمہوری ملک ہے، یہاں کا آئین اپنے ہر شہری کو آزادیٔ ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اور اپنے مذہبی امور واحکام پر عمل کرنے کی ضمانت دیتا ہے چنانچہ دستور ہند میں ''مذہب کی آزادی کا حق'' کے تحت صاف لفظوں میں درج ہے کہ

> ''تمام اشخاص کو آزادیٔ ضمیر، اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کا مساوی حق ہے، بشرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیعات متاثر نہ ہوں۔ (بھارت کا آئین حصہ۳- بنیادی حقوق دفعہ۲۵ ص۴۶)

چنانچہ اسی مذہبی آزادی کے تحت سکھ مذہب کے ماننے والے اپنی داڑھیوں اور دیگر مذہبی امتیازات کے ساتھ فوج اور پولیس میں بھرتی ہوتے ہیں، ان کی داڑھی پر نہ فوج کے کسی افسر کو اعتراض ہوتا ہے، نہ عدلیہ کو اور نہ ہی حکومت کی جانب سے اس پر کسی قسم کی قدغن عائد کی جاتی ہے۔

دستور کی اس بنیادی دفعہ، اور مضبوط ضمانت، نیز سکھ قوم کے ساتھ حکومت اور اس کے اہل کاروں کے اس معمول کے باوجود حکومت، اس کے ماتحت ادارے، حتی کہ عدلیہ تک کا رویہ مسلم اقلیت کے مذہبی امور کے بارے میں نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ جارحانہ ہے، ''بابری مسجد'' ہی کا معاملہ لے لیجیے جس کا مسجد ہونا تاریخ کے ٹھوس شواہد ہی سے نہیں خود سرکاری وعدالتی کاغذات سے بھی ثابت ہے، لیکن اس قدیم تاریخی مسجد کو کس آسانی کے ساتھ مندر میں تبدیل کردیا گیا، اس سے کون واقف نہیں ہے، کچھ اسی طرح کا رویہ مسلمانوں کی داڑھی کے بارے میں بھی اختیار

کیا جارہا ہے۔ فوج اور پولیس میں مسلم ملازمین کو داڑھی منڈوانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور ستم ظریفی کی حد ہے کہ اس غیر آئینی اور یکسر غیر منصفانہ عمل پر عدالت عالیہ کی جانب سے سند جواز بھی دیدی جاتی ہے، مسٹر بی، سی بال، کرشنا مینن جسٹس کیرلا ہائی کورٹ کا داڑھی کے عندیہ میں ۱۹۸۸ء کا فیصلہ ہمارے اس دعویٰ پر شاہد عدل ہے۔ ''انصاف کو آواز دو انصاف کہاں ہے'' جبکہ مذہب اسلام میں داڑھی رکھنا ایک خالص مذہبی وشرعی عمل ہی نہیں بلکہ اسلامی شعار ہے، جس طرح ہندو دھرم میں سر پر چوٹی رکھنا، جنیو پہننا، یا سکھ پنتھی میں سر اور داڑھی کے بال بڑھانا، یا عیسائی مذہب میں گردن میں صلیب آویزاں کرنا مذہبی علامت اور پہچان ہے، جن پر کسی قسم کی بندش عائد کرنا اور قدغن لگانا آئین بھارت کے سراسر خلاف ہوگا، اور اس رویہ کو بجا طور پر خلافِ قانون، ناانصافی اور ظلم کہا جائے گا بالکل اسی طرح مذہب اسلام میں داڑھی کا رکھنا مذہبی شعار اور دینی علامت ہے، جس پر حکومت اور اس کے ماتحت اداروں کی جانب سے کسی طرح کی بھی بندش اور رکاوٹ ایک خالص مذہبی معاملہ میں دخل اندازی ہوگی جسے بجا طور پر دستور سے انحراف اور غیر منصفانہ عمل قرار دیا جائے گا۔

مذہب اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ داڑھی داعی اسلام نبی رحمت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت اور دائمی طریقہ عمل ہے اس دائمی عمل کے ساتھ آپ ﷺ نے مذہب اسلام پر چلنے والوں کو تاکید کے ساتھ داڑھی رکھنے کا حکم بھی دیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری شریف میں آپ کا فرمان ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وفروا اللحی، واحفوا الشوارب، ایک دوسری جگہ یہی فرمان ان الفاظ میں ہے: انھکوا الشوارب واعفوا اللحی، اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں جزوالشوارب وارخوا اللحی، ان سب احادیث کا حاصل یہی ہے کہ مونچھوں کو کترا جائے اور داڑھی کے بال بڑھائے جائیں، چنانچہ آپ کے اس تاکیدی حکم اور دائمی عمل کی بناء پر فقہائے اربعہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا متفقہ فیصلہ ہے داڑھی کا مونڈنا ناجائز وحرام ہے۔ اور یہی وہ فقہائے مجتہدین ہیں جن کی بیان کردہ کتاب وسنت کی تفاسیر اور تشریحات وتفصیلات کی روشنی میں صدیوں سے (بجز شرذمۂ قلیلہ کے) پوری امت مسلمہ اپنے خدائے واحد کی عبادت اور شریعت اسلامی پر عمل کرتی چلی آرہی ہے۔

ذیل میں فقہائے اربعہ کی مشہور ومعروف اور علمائے اسلام میں متداول کتب فقہ کے مختصر حوالے ملاحظہ کیجئے:

فقہ حنفی کی مشہور فقہ کی کتابیں مثلاً درمختار، بحرالرائق، فتح القدیر وغیرہ میں داڑھی کی شرعی مقدار کو بیان کرتے ہوئے یہ تصریح موجود ہے ”واما الاخذ منها وهی دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه احد، واخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الاعاجم اه“ یعنی ایک مٹھی سے کم داڑھی کا چھانٹنا جیسا کہ بعض اہل مغرب، اور مخنث مردوں کا عمل ہے تو اس کو کسی نے بھی مباح اور جائز نہیں کیا ہے، اور پوری داڑھی کا مونڈنا (مسلمانوں کا نہیں بلکہ) ہندوستان کے یہود اور عجم کے مجوسیوں کا طریقہ ہے۔

اور شوافع کے مشہور عالم وفقیہہ علامہ احمد بن قاسم عبادی ”تحفۃ المحتاج“ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے اپنی انتہائی اہم تصنیف کتاب الام میں صراحت سے تحریر کیا ہے کہ داڑھی کا مونڈنا حرام ہے، اسی طرح امام زرکشی، امام حلیمی، اور ان کے استاذ قفال شاشی وغیرہ فقہائے شوافع لکھتے ہیں کہ ”الصواب تحريم حلقها جملة لغير علة“ درست بات یہی ہے کہ پوری داڑھی کا بغیر کسی معتبر عذر کے مونڈنا حرام ہے۔

علامہ شیخ احمد النفراوی المالکی ”رسالہ امام ابن ابی زید“ کی شرح میں لکھتے ہیں ”وفی قص الشوارب واعفاء اللحی مخالفة الاعاجم فانهم كانوا يحلقون لحاهم ويعفون الشوارب، وآل كسرى ايضاً كانت تحلق لحاها وتبقی الشوارب، فما عليه الجند فی زماننا من امر الخدم بحلق لحاهم دون شواربهم لاشك فی حرمته عند جميع الائمة لمخالفته لسنة المصطفٰی صلی اللّٰه عليه وسلم ولموافقته لفعل الاعاجم والمجوس، والعوائد لايجوز العمل بها الا عند عدم نص عن الشارع مخالف لها، والا كانت فاسدة يحرم العمل بها، الاترىٰ لو اعتاد الناس فعل الزنا او شرب الخمر لم يقل احد بجواز العمل بها“ اھ.

یعنی مونچھوں کے تراشنے، اور داڑھی کے بڑھانے میں عجمیوں کے طریقہ کی مخالفت ہے، کیوں کہ یہ لوگ داڑھیوں کو مونڈتے اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں، اور ایران کے مجوس بھی داڑھیوں کو چھیلتے اور مونچھوں کو باقی چھوڑ دیتے تھے، لہٰذا ہمارے زمانہ میں سرکاری فوج میں بھرتی لوگوں کا یہ طریقۂ عمل کہ وہ مونچھوں کی بجائے داڑھی کو مونڈتے ہیں، بغیر کسی شک وشبہ کے تمام ائمہ کے نزدیک ان کا یہ عمل حرام ہے، کیونکہ یہ محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی مخالفت اور عجمیوں اور مجوسیوں کے عمل کی موافقت ہے (جبکہ شرعی امور میں ان کی مشابہت وموافقت ممنوع ہے) رہا

معاملہ لوگوں کی عمومی عادت و معمول کا تو اس پر عمل اسی وقت جائز ہوسکتا ہے جبکہ اس عادت و معمول کے خلاف شارع کی نص موجود نہ ہو، اس کے خلاف شارع کی نص ہوتے ہوئے یہ عادت ازروئے شرع فاسد ہوگی اور اس پر عمل کرنا حرام ہوگا۔

یہ بات کسے نہیں معلوم ہے کہ اگر عام لوگ زنا یا شراب کے عادی ہوجائیں تو ان کی اس عادت کی بناء پر زنا یا شراب نوشی کو جائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اور فقہ حنبلی کی معروف و معتبر کتاب شرح مختصر المقنع میں ہے "ویعفی لحیته ویحرم حلقها ذکره الشیخ تقی الدین، ولا یکره اخذ ما زاد علی القبضة، وماتحت حلقه، ویحف شاربه وهو اولیٰ من قصه" اور اپنی داڑھی کو بڑھائے، داڑھی کا مونڈنا حرام ہے اس مسئلہ کو شیخ تقی الدین رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے، اور ایک مٹھی سے زائد داڑھی کے بال کا کاٹنا مکروہ نہیں ہے، اسی طرح حلق کے نیچے کے بال تراشنا بھی مکروہ نہیں ہے، اور مونچھوں کو جڑ سے صاف کردینا اس کے چھانٹنے سے بہتر ہے۔

رسول خدا ﷺ کے قول و عمل اور فقہائے مجتہدین کی ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان شہری کو خواہ وہ محکمہ فوج و پولیس کا ملازم کیوں نہ ہو داڑھی نہ رکھنے پر مجبور کرنا نہ صرف آئین بھارت کی کھلی خلاف ورزی ہے بلکہ حقوق انسانی کے بین الاقوامی قانون کی بھی صریح مخالفت ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ بعینہٖ اسی معاملہ میں سکھ قوم کو اپنے مذہب کے مطابق داڑھی رکھنے کی حکومت اور اس کے ماتحت اداروں کی جانب سے مکمل آزادی ہے۔

داڑھی بہرحال داڑھی ہے چاہے وہ کسی مسلم کے چہرے پر ہو یا سکھ وغیرہ کے چہرے پر، اگر سکھ کی داڑھی اس کے لئے اپنی فوجی وغیرہ ملازمت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں حارج اور مانع نہیں ہے تو پھر یہی داڑھی ایک مسلم فوجی ملازم کے لئے اس کے فرائض کی ادائیگی میں کس طرح رکاوٹ بنے گی؟ ''اک بام دو ہوائے'' اور من وتو کے اس واضح و بین فرق کو کیسے معقول اور درست مانا جاسکتا ہے۔ حکومت اور اس کے اہل کار اگر واقعی دستور ہند کو تسلیم کرتے ہیں، قانون وانصاف کی ان کی نگاہوں میں کوئی حیثیت ہے تو پھر انھیں اپنے اس رویہ پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور سکھوں کی طرح مسلم اقلیت کے اس دستوری مذہبی حق کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی بجائے پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کی جانب سے ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ مسلم اقلیت اپنے اس مذہبی حق کو آزادی کے ساتھ استعمال کرسکے، یہی آئین بھارت کا تقاضا

ہے، قانون وانصاف یہی چاہتے ہیں، ملک کی سیکولر قدریں اسی صورت میں محفوظ رہ سکتی ہیں۔

پھر حکومت کا اپنے اس غیر منصفانہ رویہ کو درست ٹھہرانے کے لئے یہ دعویٰ کہ ''داڑھی رکھنا مسلمانوں کے لئے مذہباً لازم نہیں ہے''، ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کا مصداق ہے، کون نہیں جانتا کہ کسی مذہب کے امور واحکام کی توضیح وتشریح ان کے درمیان مراتب ودرجات کی تعیین وترتیب کہ اس مذہب میں کونسا حکم فرض ولازم، اور کونسا سنت ومستحب یا مباح ہے، اس مذہب کے قابل اعتماد ماہرین ہی کرسکتے ہیں، اور فقہائے اسلام جن پر امت کا سواد اعظم مکمل اعتماد کرتا ہے اس ضروری خدمت کو صدیوں پہلے انجام دے چکے ہیں، اور عام مسلمان سلف صالحین اور اپنے بزرگوں کی اس خدمت کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں، اب کسی اور کی تشریح وتفصیل کی انہیں ضرورت نہیں ہے۔ پھر ایک سیکولر ملک کی حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ مذہبی حدود میں مداخلت اور دراندازی سے اپنے آپ کو دور رکھے اور مذہبی معاملات ونظریات کے بارہ میں قطعاً غیر جانب دار رہے، حکومت کا یہی طرز عمل، ملک، قوم اور خود حکومت کے حق میں مناسب اور بہتر ہے بصورت دیگر ملک میں انتشار، بدامنی، افراتفری پھیلنے کا قوی اندیشہ ہے، جو سب کے لیے غیر مناسب اورنامبارک ہوگا۔

''قیدیوں کے مسائل اسلامی نقطۂ نظر سے''

از: مولانا اختر امام عادل قاسمی
جامعہ ربانی منورواشریف

آج دنیا میں انسانوں کے درمیان جو طبقاتی تقسیم اور ان کے درمیان حقوق کی ناہمواری پائی جاتی ہے اس کی ایک بدترین مثال انسانوں کا وہ طبقہ ہے جو اپنے بعض حالات کی بناء پر قیدخانہ کی سلاخوں کے پیچھے زندگی گذارنے پر مجبور ہے، اس کے بالمقابل اسلام کے عادلانہ نظام میں انسانی تمام طبقات کے لئے مثالی توازن و ہم آہنگی اور ان کے حقوق و جذبات کی ہر ممکن رعایت پائی جاتی ہے۔

اسلام نے اپنی تمام تعلیمات میں قیدیوں کے ساتھ عام انسانی احترام میں کوئی کمی نہیں کی، اسلامی نقطۂ نظر سے ہر انسان ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوا ہے اس لئے اس کو اپنے حقوق کے معاملے میں پوری آزادی ملنی چاہئے۔ البتہ انسان کبھی ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہوجاتا ہے، جو عام انسانی اجتماع کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں ایسے موقعہ پر عام انسانی مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ اس شخص کی سرگرمیوں کو محدود کیا جائے، یا اس پر مکمل بندش عائد کردی جائے، اسی کے لئے قید کی ضرورت پڑتی ہے، حضرت نبی کریم ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوئی باقاعدہ قیدخانہ یا جیل کا نظام نہیں تھا، اور نہ کبھی باضابطہ حضور ﷺ نے کسی کے لئے قید کی سزا تجویز فرمائی۔ (اقضیۃ رسول اللہ ﷺ لابن فرح/۱۱، تبصرۃ الحکام لابن فرحون، الموسوعۃ ۲۸۴/۱۶)

صرف تحقیق حال کے لئے بعض ملزمین کو وقتی طور پر قید کا حکم فرمایا، مثلاً:

ایک مرتبہ قبیلہ بنوغفار کے دو شخص حضور ﷺ کے حضور پیش کیے گئے، ان پر دو اونٹوں کی چوری کا الزام تھا، حضور ﷺ نے ایک کو روک لیا اور دوسرے کو اونٹ تلاش کرنے کا حکم دیا، بالآخر

وہ دوسرا شخص دونوں اونٹ لے کر دربار نبوت میں واپس ہوا اور پھر دونوں کی رہائی عمل میں آئی۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰/۲۱۶-۲۱۷)

قید کا نظام

عہد فاروقی سے اس کا آغاز ہوا اور ضرورت کے تحت قید خانہ کا نظام رائج کیا گیا، حضرت عمر فاروقؓ کے حکم پر مکہ کے گورنر نافع بن عبدالحارث نے اس غرض سے چار ہزار (۴۰۰۰) درہم میں صفوان بن امیہ کا مکان خریدا، اسی طرح حضرت علی نے کوفہ میں باقاعدہ قید خانہ قائم کیا۔ (المبسوط ۲۰/۸۹، الطرق الحکمیہ ۱۰۳، الموسوعۃ ۱۶/۳۱۶)

نیز حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے کوفہ میں اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ مکرمہ میں اپنے اپنے عہد حکومت میں قید خانہ قائم فرمایا۔ (تفسیر خازن ۲/۷۱، زادلمعاد ۲/۴۷، الموسوعۃ ۱۶/۲۸۶)

پھر بعد کے ادوار میں تمام ہی مسلم حکمرانوں نے اس نظام کو باقی رکھا، اور اسلامی قاضیوں نے مختلف جرائم میں قید کی سزا تجویز فرمائی - لیکن یہ سب محض وقتی اور ناگزیر ضرورت کے تحت گوارا کیا گیا، اسی لئے قید کے کسی مرحلے پر بھی انسانی احترام کو نظر انداز نہیں کیا گیا، اسلام نے قیدیوں کے ساتھ مراعات اور حسن سلوک کی تعلیم دی، اور ہر حال میں اس پہلو پر دھیان مرکوز رکھا کہ وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں، ان کے پاس بھی ضروریات اور تقاضے ہیں اور وہ بھی جذبہ واحساس رکھتے ہیں، اور کل وہ بھی تمہاری طرح آزاد تھے، حالات زمانہ نے ان کو اس حال تک پہنچا دیا ہے، اس لئے ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرو۔

قیدیوں کے لئے اسلامی ہدایات

غزوہ بدر میں فتح کے بعد جنگی قیدی حضور ﷺ کے سامنے پیش کیے گئے تو زبان نبوت سے جو جملہ صادر ہوا وہ قیدیوں اور کمزور طبقہ کے لیے نبوت کا سب سے بڑا عطیہ ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یا ایھا الناس ان اللّٰہ قد امکنکم وانما ھم اخوانکم بالامس (مجمع الزوائد ۱/۸۷)

ترجمہ: اے لوگو! اللہ نے آج تم کو ان پر قدرت دی ہے اور کل یہ تمہارے بھائی تھے۔

قرآن کریم میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ابرار اور مقربین کی صفت قرار دیا گیا:

ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرا (سورہ دہر:۸)

ترجمہ: اور یہ لوگ پوری محبت وخلوص کے ساتھ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

حضور ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی:

استوصوا بالاساری خیرا (طبرانی کبیر بحوالہ سیرۃ المصطفیٰ ۱/۵۷۹، مولانا ادریس کاندھلوی)

ترجمہ: قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت قبول کرو۔

غلام جیسے کمزور طبقہ کے بارے میں فرمایا:

فاطعمه مما تاکلون واکسوه مما تکسون (احمد وابوداؤد، مشکوۃ ۲۹۲)

ترجمہ: جو خود کھاتے ہو ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو ان کو پہناؤ۔

ان کی عزت نفس کا بھی پورا لحاظ فرمایا، اور ارشاد فرمایا:

لاتقل عبدی ولا امتی ولکن قل فتائی وفتاتی (مجمع الزوائد ۶/۸۷)

ترجمہ: غلام اور باندی کہہ کر ان کو مت پکارو بلکہ اے میرے بیٹے اور اے میری بیٹی کہہ کر آواز دو۔

انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ عہد اوّل میں جن مسلمانوں کے پاس قیدی تھے وہ اوّل کھانا قیدیوں کو کھلاتے اور بعد میں خود کھاتے اور اگر کھانا نہ بچتا تو خود کھجور پر اکتفاء کر لیتے۔

حضرت مصعب بن عمیر کے حقیقی بھائی ابوعزیز بن عمر بھی ایک بار قید ہو کر آئے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کے جس گھر میں تھا ان کا یہ حال تھا کہ صبح وشام جو تھوڑی بہت روٹی بنتی وہ مجھ کو کھلا دیتے اور خود کھجور کھاتے، میں شرماتا اور ہر چند اصرار کرتا کہ روٹی آپ لوگ کھائیں لیکن نہ مانتے اور یہ کہتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے۔ (مجمع الزوائد ۶/۸۶)

(دعویٰ) الزام عائد کرنے کا ضابطہ

غرض اسلام ہر انسان کی شخصی آزادی اور احترام کو بہت اہمیت دیتا ہے، اور کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا ہے کہ کسی کی آزادی وعزت نفس کو نقصان پہنچائے، اسی لیے شریعت اسلامیہ اس کی اجازت نہیں

دیتی کہ خواہ مخواہ کسی پر الزام لگا کر اس کی حیثیت کو مجروح کیا جائے، اور نہ اسلامی عدالت اس کی مجاز ہے کہ محض الزام کی بنا پر کسی کو مجرم قرار دے، الزام لگانے کے لیے ضابطہ مقرر کیا گیا کہ

البینة علی المدّعی والیمین علی من انکر (متفق علیہ: نصب الرایہ ۴/۹۵)

ترجمہ: ''دعوی پیش کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ ثبوت فراہم کرے بصورتِ دیگر منکر سے قسم لے کر اس کو بری قرار دیا جائے گا۔''

بلکہ بعض صورتوں میں تو ثبوت فراہم نہ کرنے کی صورت میں خود مدعی کو مجرم قرار دیا جاتا ہے، اور اس کو بے بنیاد الزام لگانے کے جرم میں سزا دی جاتی ہے، مثلاً کوئی شخص کسی پر ''زنا'' کا الزام لگائے اور اس کو اصول کے مطابق ثابت نہ کرسکے، تو خود الزام لگانے والے پر حد قذف عائد کی جاتی ہے، اس سے تعزیرات کے باب میں اسلام کے تصورِ جرم کا پتہ چلتا ہے کہ ''جرم'' صرف وہ ہے جس کو ثابت کردیا جائے۔ اور جو ثابت نہ ہوسکے وہ صرف ''الزام'' ہے۔

ملزم کو قید کرنے کا مسئلہ

محض الزام کی بناء پر کسی پر سزا نافذ نہیں کی جاسکتی، البتہ کبھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے جس میں الزام کی تنقیح اور ثبوت کی فراہمی میں تھوڑا وقت لگ سکتا ہے، اس درمیانی مدت میں ملزم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ جبکہ وہ ابھی مجرم نہیں ہے، لیکن تنقیح دعویٰ تک کیا اس کو ''قید'' میں رکھا جاسکتا ہے؟ اس باب میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

(۱) قاضی شریح، امام ابویوسف، اور امام الحرمین کی رائے میں مکمل ثبوت کے بغیر محض الزام کی بنا پر کسی کو قید نہیں کیا جاسکتا، قاضی شریح نے ایک مالی معاملہ میں ماخوذ ملزم کو ثبوت نہ ملنے کی صورت میں محض قسم لے کر بری کردیا تھا۔ (تبصرۃ الحکام ۱/۲۰۷)

امام ابویوسف اس طرح کی صورت میں زیادہ سے زیادہ کسی معتبر ضمانت دار کا مطالبہ کرتے ہیں، ضمانت مل جانے کی صورت میں ملزم کو اپنے گھر جانے کی اجازت ہے۔ (کتاب الخراج ۱۹۰، ۱۹۱)

اس سلسلے میں ایک واقعہ حضرت عمر بن الخطاب کا نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک ملزم گرفتار کرکے لایا گیا، اور ثبوت فراہم نہ ہوسکا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ (المحلی لابن حزم ۱۱/۱۳۱، مصنف عبدالرزاق ۱۰/۲۱۷)

(۲) بعض فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ جن مقدمات میں ثبوت جرم کے بعد قید ہی کی سزا مقرر رہے، مثلاً مالی معاملات، ان میں مکمل ثبوت کی فراہمی کے بغیر ملزم کو قید میں رکھنا درست نہیں ہے۔

سحنون وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ جن مقدمات کی سزا قید نہیں ہے مثلاً حدود وقصاص کے معاملات، ان میں عدالتی کارروائی مکمل ہونے تک ملزم کو قید میں رکھا جاسکتا ہے۔ (حاشیہ القلیوبی ۴/۳۰۶، درمختار مع ردالمحتار ۴/۴۰، ۵/۲۹۹، العنایہ للباہرتی ۵/۴۰۱، المغنی لابن قدامہ ۹/۳۲۸)

(۳) جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر ملزم کوئی معروف اور نیک شخص ہو، اور اس کی ذاتی زندگی غیر مشتبہ اور صاف ستھری سمجھی جاتی ہو، تو ایسے شخص کو بلاثبوت قید کرنا یا سزا دینا درست نہیں، البتہ مستورالحال شخص کو تحقیق حال تک قید کرنا درست ہے، یا ملزم کوئی مشتبہ شخص ہو اور اس طرح کے الزامات اس پر لگتے رہے ہوں تو اس کو بھی قید کرنا درست بلکہ نسبتاً بہتر ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۴/۸۸، حاشیہ الدسوقی ۳/۲۷۹، الاحکام السلطانیہ للماوردی ۲۱۹، المغنی لابن قدامہ ۹/۳۲۸ بحوالہ الموسوعۃ ۱۶/۲۹۲)

قید کا ثبوت

جمہور کی بنیاد درج ذیل آیات واحادیث ہیں:

❁ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وتحبسونهما من بعد الصلوة فيقسمان بالله (مائدة:۱۰۶)

ترجمہ: ان کو قید کرو نماز کے بعد، پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں۔

اس میں ادائے حق تک قید کرنے کا جواز ملتا ہے۔

❁ اسی طرح ایک حدیث جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے کہ "دربار نبوت میں قبیلہ بنوغفار کے دو شخص دو اونٹوں کی چوری کے الزام میں پکڑ کر لائے گئے، آپ نے دونوں میں سے ایک کو اپنے پاس روک لیا، اور دوسرے کو اونٹ حاضر کرنے کا حکم دیا، بالآخر وہ شخص گیا اور دونوں اونٹ لے کر حاضر ہوا۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰/۲۱۶، ۲۱۷، مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل)

نیز روایت ہے کہ واقعہ خیبر کے بعد ابن ابی الحقیق کو دربار نبوت میں پیش کیا گیا، اس پر ایک خزانہ کو چھپانے کا الزام تھا، جبکہ اس کا دعویٰ تھا کہ خزانہ خرچ ہو چکا ہے، مگر نبی کریم ﷺ نے اس

شبہ کی بنا پر اس کا دعویٰ رد کر دیا کہ ابھی جنگ کو بہت دن نہیں ہوئے، اور مال بہت زیادہ تھا۔ (العهد قريب والمال اكثر) اور آپ نے تحقیق حال تک اس کو قید رکھنے کا حکم دیا، اور حضرت زبیر بن عوامؓ کو ملزم کے احتساب اور پوچھ گچھ پر مامور فرمایا، حضرت زبیرؓ کی تھوڑی سی تادیبی کارروائی کے بعد ہی اس نے خزانہ کی نشاندہی کر دی۔ (ثم امر الزبير ان يمسه بعذاب حتى ظهر الكنز) (ابوداؤد ۳/ ۴۰۸، تحقیق عزت عبید دعاس، فتح الباری ۵/ ۳۲۸ مطبوعہ السّلفیہ تبصرة الحکام ۲/ ۱۱۴)

❁ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے دو ملزموں کو اقرار تک قید کرنے کا حکم دیا۔ (تبصرة الحکام ۲/ ۱۴۰)

ان احادیث و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہور فقہاء کا موقف اس سلسلے میں زیادہ مضبوط ہے۔ نیز یہ بات قرین قیاس بھی ہے، اس لیے کہ ملزم بعض حالات میں اپنے برے انجام سے بچنے کے لیے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے، اور اس طرح عدالتی کارروائی تعطل کا شکار ہو سکتی ہے، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ملزم کے باہر رہنے کی صورت میں مدعی کی طرف سے اسے کسی زیادتی کا سامنا کرنا پڑے، اس لیے ملزم اور مدعی دونوں کے لیے محفوظ صورت یہ ہے کہ ملزم کو حراست میں رکھا جائے، اور عدالتی کارروائی مکمل ہونے تک اس کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ البتہ ملزم اگر معروف اور غیر مشتبہ شخص ہو، اس کے فرار ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور نہ اس کی ذاتی حفاظت کا کوئی خطرہ ہو، تو عدالت اس پر اعتماد کر سکتی ہے، اسی طرح اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ مشتبہ ملزم جس کو عدالت کارروائی مکمل ہونے تک قید کرنے کا حکم دے گی وہ قید خانہ میں عام شہری کی طرح زندگی گذارے گا اور اس کو کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی اذیت نہیں دی جائے گی۔

قید کی مدت

اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مشتبہ ملزم کے لیے قید کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے، یہ حاکم کی صوابدید اور متعلقہ حالات پر موقوف ہے، جتنے دنوں میں صورت حال منقح ہو جائے، اتنے دنوں تک قید میں رکھنے کی گنجائش ہے، علامہ ابن تیمیہ نے اس قول کو امام مالک، امام احمد اور محققین حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۷، حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۸۸)

جبکہ مالکیہ کی یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ مستور الحال کو لمبے عرصہ تک قید میں نہیں رکھا جا سکتا، لمبے

عرصہ کا اطلاق ان کے نزدیک ایک سال سے زائد پر ہوتا ہے۔ (تبصرۃ الحکام ۱/ ۲۶۶، بحوالہ الموسوعۃ ۱۶/ ۲۹۴)

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ مستورالحال ملزم کو ایک دن سے زیادہ قید نہیں کیا جاسکتا، کچھ لوگوں نے دو تین دن مقرر کیا ہے، اور بعض نے اس کو وسعت دے کر ایک ماہ تک کی اجازت دی ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۸۸، تبصرۃ الحکام ۲/ ۱۴۸، المغنی لابن قدامہ ۹/ ۳۲۸)

مگر حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا ظاہر مذہب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ مدت کی کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی، متعلقہ حالات اور حاکم کی رائے پر منحصر ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بھی یہی رائے نقل کی جاتی ہے۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی ۲۲۰)

❁ ایسے لوگ جن پر کسی قسم کا الزام تو نہ ہو، مگر ان سے مفاد عامہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، ایسے لوگوں کو بھی نظر بند یا قید کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، فقہاء نے اس کی مثال میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی نظر لگتی ہو۔ (حاشیہ ابن عابدین ۶/ ۳۶۴، حاشیہ القلیوبی ۴/ ۱۶۲، فتح الباری ۱۰/ ۲۰۵)

❁ اسی طرح ایسے مجرمین جن کا جرم ثابت ہو چکا ہو، اور عدالت نے ان کو قابل سزا قرار دیا ہو، مگر بیماری یا کسی اور سبب سے متعلقہ سزا ان پر جاری نہ کی جاسکتی ہو تو سبب کے خاتمہ تک ان کو قید میں رکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ مجرم ایسا ہو جس کے فرار کا اندیشہ ہو، بصورت دیگر اس کو آزاد رکھ کر سبب کے خاتمہ کا انتظار کیا جائے گا۔ (درمختار مع ردالمحتار ۴/ ۱۶، المدونہ ۵/ ۲۰۶)

قیدیوں کے حقوق

جن ملزمین پر جرم ثابت ہو جائے اور عدالت ان کے لیے سزائے قید کا فیصلہ سنا دے، ان کو سزا کے طور پر قید خانہ میں رکھا جائے گا، مگر عام حالات میں ان کو عام انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا، اور ان کی بنیادی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا، فقہاء اسلام نے پوری تفصیل کے ساتھ ان امور پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً:

(الف): ”مذہبی امور“

قیدیوں کو ان کے مذہبی امور میں مکمل آزادی حاصل ہوگی، وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت وغیرہ انجام دے سکیں گے، ان کے مذہب کے مطابق ان کو غذا فراہم کی جائے گی، فقہاء

نے صراحت کی ہے کہ مسلم قیدیوں کو وضو اور نماز وغیرہ سے روکنا درست نہیں ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار ۵/۳۷۸، ۳۷۹، حاشیہ القلیوبی ۴/۲۰۵)

اگر جمعہ اور عیدین کا انتظام قید خانہ میں ہو، اور شرائط جمعہ بھی موجود ہوں تو قیدیوں کو قید خانہ ہی میں جمعہ وعیدین کی اجازت ہوگی، حنفیہ کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قیدیوں کے لیے جمعہ کی اجازت ہے، اور اگر جمعہ کا انتظام نہ ہو، تو قیدی تنہا تنہا ظہر ادا کریں گے۔ (ہدایہ ۱/۶۳، المبسوط ۲/۳۶)

بعض حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ قید خانہ میں جمعہ وعیدین کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں قیدیوں کو باہر نکلنے کی اجازت ہوگی، شافعیہ میں بغویؒ اور بوبطی، اور حنفیہ میں سرخسی کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۲۱ بحوالہ غایۃ المنتہی للکرخی ۱/۲۰۶، روضۃ الطالبین ۴/۱۴۰)

مگر مذاہب اربعہ کے جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جمعہ وعیدین کے لیے قیدیوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ اگر بعض قیدیوں کے لیے حاکم اس میں مضائقہ نہ سمجھے تو حرج نہیں۔ (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۲۱ بحوالہ حاشیہ ابن عابدین ۵/۳۷۷، المبسوط ۲۰/۹۰، المغنی ۲/۳۳۹ وغیرہا)

ظاہر ہے کہ اس عموم میں ان کی مذہبی کتابوں کا احترام بھی شامل ہے، اس لیے کہ قید کا مقصد تادیب واصلاح ہے، توہین آمیز یا اشتعال انگیز سلوک کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس سے ردعمل کی نفسیات جنم لیتی ہیں، اور اصلاح کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

رہا دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین کا کام؛ تو یہ حاکم کی صوابدید پر موقوف ہونا چاہئے اس لیے کہ دعوت اس کی بنیادی یا مذہبی ضروریات میں شامل نہیں ہے، نیز دعوتی کام کبھی قیدیوں میں گروپ بندی بھی پیدا کرسکتی ہے، اور داعی قیدی اس طرح قوت بھی حاصل کرسکتا ہے، اس لیے اس کی اجازت حاکم کی رائے پر منحصر ہوگی، داعی قیدی کے شخصی حالات اگر مثبت محسوس ہوں تو حاکم اس کو دعوتی کام کی اجازت دے سکتا ہے ورنہ نہیں۔

(ب): ”جسمانی ضروریات“

قیدیوں کی جسمانی ضروریات اور بنیادی راحت وآرام کا لحاظ رکھنا بھی لازم ہے، مثلاً: مناسب غذا اور پینے کا صاف ستھرا پانی فراہم کیا جائے گا، حفظان صحت کے لیے اگر ورزش وتفریح کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ہوگی، ایسی تنگ جگہوں میں قیدیوں کو رکھنا درست نہیں ہے، جہاں ہوا اور روشنی کا گذر نہ ہو، یا جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو، جہاں گھٹن کا

احساس ہو، یا ایسی جگہ پر رکھنا جہاں دھواں بھرا ہوا ہو، یا سخت گرم یا سخت ٹھنڈے مکان میں جہاں زندگی دشوار ہو، یا کھلے آسمان کے نیچے جہاں گرمی یا سردی سے جسم بیمار پڑ جائے، ایسی جگہوں پر قیدیوں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر کسی قیدی کو ایسے تنگ مقامات پر رکھا گیا، یا غذا اور پانی کا معقول انتظام نہیں کیا گیا، اور وہ مر گیا، تو اس کی دیت اس شخص کے ذمہ لازم ہے جس کی لاپرواہی سے قیدی کا یہ انجام ہوا ہے، بلکہ بعض فقہاء نے تو قصاص کو واجب کیا ہے۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی ۲۳۹، حاشیہ ابن عابدین ۲/۴۲۱، فتاویٰ ہندیہ ۳/۴۱۴، الموسوعۃ ۱۶/۳۲۷)

”طبی سہولیات“

طبی سہولیات بھی قیدیوں کو فراہم کی جائیں گی، اور اگر جیل میں یہ سہولتیں میسر نہ ہوں تو شافعیہ اور مالکیہ ان کو جیل سے باہر لے جانے کی اجازت دیتے ہیں، البتہ مفتی بہ قول میں حنفیہ یہ قید لگاتے ہیں کہ بیمار قیدیوں کو باہر لے جانے کے لیے معتبر ضمانت شرط ہے، مسلم خلفاء اور حکمرانوں کا تعامل اس باب میں شروع سے یہی رہا کہ قیدیوں کی جسمانی صحت اور طبی سہولیات کی طرف پوری توجہ دی گئی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باقاعدہ ایک فرمان کے ذریعہ مملکت کے تمام افسروں کو اس کی طرف خصوصی طور پر توجہ دلائی تھی، خلیفہ مقتدر کے زمانہ میں ڈاکٹروں کی خصوصی خدمات بیمار قیدیوں کے لیے حاصل کی گئی تھیں اور دوا علاج کا پورا انظام بنایا گیا تھا یہ ڈاکٹر ہر روز قید خانہ پہنچ کر قیدیوں کا معائنہ کرتے اور علاج تجویز کرتے تھے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۵/۳۷۸، فتاویٰ ہندیہ ۴/۴۱۸، شرح ادب القاضی للخصاف ۲/۳۷۵، حاشیہ القلیوبی ۲/۲۹۲، طبقات ابن سعد ۵/۳۵۶، الموسوعۃ ۱۶/۳۲۱)

بیوی سے تعلق کے سلسلے میں فقہاء کی آرا مختلف ہیں:

(۱) ایک رائے جس کو اکثر حنفیہ نے اختیار کیا ہے، اور حنابلہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ قیدی کو بیوی سے ملنے کی اجازت دی جائے گی بشرطیکہ تنہائی کی ایسی جگہ وہاں میسر ہو، اس لیے کہ پیٹ کی طرح شرمگاہ کی بھوک بھی ایک ضرورت ہے، اس لیے اس ضرورت سے اس کو روکا نہیں جائیگا۔

(المغنی ۷/۳۴، ۳۵، ہدایہ ۳/۲۳۱، فتح القدیر ۵/۴۷۱، فتاویٰ ہندیہ ۳/۴۱۸)

(۲) دوسری رائے جس کو مالکیہ کا مذہب کہا گیا ہے، بیوی سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نہیں ہوگی اس لیے کہ جنسی تعلق کھانے کی طرح حوائج اصلیہ میں شامل نہیں ہے، نیز اس طرح کی لذتوں سے روکنے سے قیدی کی دل شکنی ہوگی، اور وہ اپنے اصلاح حال کی طرف زیادہ تیزی کے

ساتھ توجہ دے گا۔ (الشرح الکبیر....۳/۲۸۱، تبصرۃ الحکام ۲/۲۰۵، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۲۴)

(۳) اور بعض شوافع کی رائے ہے کہ یہ بھی حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے، اگر وہ مصلحت سمجھے تو اجازت دیدے ورنہ نہیں۔ (حاشیہ القلیوبی ۲/۳۹۲، الموسوعۃ ۱۶/۳۲۴)

(ج): ''سماجی حقوق''

قیدیوں کو عام حالات میں اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، تعلیم و ہنر سیکھنے، احباب و اقارب سے رابطہ رکھنے اور دوسرے قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہوگی، البتہ اگر کسی وجہ سے حاکم وقت بعض قیدیوں کے لیے اس کو خلاف مصلحت سمجھے تو اس پر پابندی عائد کرسکتا ہے، بعض شوافع سے اسکی صراحت نقل کی گئی ہے۔ (دیکھئے حاشیہ القلیوبی ۲/۳۹۲، رسنی المطالب مع حاشیہ الرملی ۲/۱۸۸، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۲۴)

جس طرح کہ حاکم کو اس کی اجازت ہے کہ کسی خاص مجرم کو اس کے جرم کے پس منظر میں قید تنہائی کی سزا دے، جہاں کسی سے ملنے کی اس کو اجازت نہ ہو، فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے۔ (المبسوط ۲۰/۹۰، فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۵/۳۱۰، المغنی ۸/۱۲۴، الموسوعۃ ۱۶/۳۱۹)

(د): ''اخلاقی امور''

فقہاء نے جرائم کے لحاظ سے الگ الگ قید خانہ یا قید خانہ میں الگ الگ حصے بنانے کی تجویز دی ہے، امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب ''الخراج'' میں، با قاعدہ ایک باب اس عنوان پر قائم کیا ہے، اور مجرمین کو بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم کیا ہے:

۱- اہل فجور: یعنی جن گناہوں کا تعلق اخلاقی مفاسد سے ہو۔

۲- اہل تلصص: یعنی چوری وغیرہ کے قبیل کی چیزیں۔

۳- اہل جنایات: یعنی ظلم وزیادتی کے ذیل کی چیزیں۔

اس طرح کی کچھ اور تقسیمات بعض دیگر فقہاء کے یہاں بھی ملتی ہیں، ان تقسیمات کا مقصد یہ ہے کہ قیدیوں میں جرائم پھیلنے سے روکا جائے، اس لیے کہ جرائم کا رجحان بڑی تیزی سے ساتھ پھیلتا ہے، اور ایک طرح کا مجرم دوسری طرح کے مجرم سے بہت جلد متاثر ہونے لگتا ہے، لیکن اگر ہر قسم کے مجرمین الگ الگ ہوں، تو دوسرے جرائم سے ان کے محفوظ رہنے کا زیادہ امکان ہے۔

(کتاب الخراج ۱۶۱، ابن عابدین ۵/۳۷۰، الموسوعۃ ۱۶/۳۱۹)

۞ اسی طرح اخلاقی مفاسد سے بچنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ مردوں اور عورتوں کو الگ الگ رکھا جائے، تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے، بلکہ عورتوں کے حصے کا نگراں افسر بھی کسی عورت ہی کو رہنا چاہیے، اگر اس قسم کی عورت میسر نہ ہو تو صلاح وتقویٰ میں معروف شخص کا انتخاب ہونا چاہیے۔ (مبسوط ۹۰/۲۰، فتاویٰ ہندیہ ۴۱۴/۳، جواہر الاکلیل للآبی ۹۳/۲، الموسوعۃ ۳۱۷/۱۶)

۞ کبھی بالغوں کے ساتھ نابالغ لڑکے بھی بعض جرائم میں شریک ہوجاتے ہیں، ایسے نابالغ لڑکوں کو قید میں ڈالا جاسکتا ہے یا نہیں؟

مالکیہ اور شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ صرف تادیبی کاروائی کی جائے گی، قید میں نہیں ڈالا جائے گا خواہ مالی معاملہ ہو یا غیر مالی، لیکن فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ مالی اور غیر مالی دونوں قسم کے جرائم میں نابالغ لڑکوں کو محض تادیب وتنبیہ کے لیے (نہ کہ سزا کے طور پر) قید میں ڈالنے کی اجازت ہے، تاکہ عام لوگ ان کے ضرر سے محفوظ رہیں، اور ان بچوں کی تنبیہ بھی ہو، البتہ ایسی صورت میں فقہاء نے لازم قرار دیا ہے کہ ان کو بالغوں سے الگ ایسی جگہ پر رکھا جائے، جہاں ان کا کوئی مناسب رہنما اور مربی موجود ہو، تاکہ وہ بالغوں کے شر سے ممکن طور پر محفوظ رہ سکیں۔

(درمختار ۲۵۳/۴، فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۷۹/۳۴، حاشیہ الدسوقی ۲۸۰/۳، معین الحکام ۱۸۷، الموسوعۃ ۳۱۷/۱۶، ۳۱۸)

"طریقۂ احتساب"

۳- یہ ایک حقیقت ہے کہ ثبوت جرم کے لیے اگر شواہد موجود نہ ہوں، تو مجرم آسانی کے ساتھ اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتا، اس کے لیے تھوڑی سختی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ایک مثال عہد نبوت میں ابن ابی الحقیق کا واقعہ ہے، جس نے ایک خزانہ غائب کردیا تھا، اور اس کا اقرار نہیں کررہا تھا نبی کریم ﷺ کے حکم پر حضرت زبیر ابن العوام نے جب اس کے ساتھ سختی کی تو اس نے اس کا اقرار کیا۔ (رواہ البخاری، فتح الباری ۳۲۸/۵)

اسی روایت کی بنا پر فقہاء نے مجرموں کے ساتھ فی الجملہ سختی کی اجازت دی ہے، اور اگرچہ جبر واکراہ کی حالت میں اقرار معتبر نہیں ہے، مگر متاخرین حنفیہ نے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اس کی افادیت تسلیم کی ہے، اور اس حالت کے اقرار کو کسی نہ کسی درجہ میں درست قرار دیا ہے، چوری کی بحث کے ذیل میں حصکفی لکھتے ہیں:

فیقطع اذا اقربها مرة طائعاً واقراره بها مکرها باطل ومن المتأخرین من أفتی

بصحته و یحل بضربه لیقر. (درمختار ۱۰۶/۶)

شامی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدود کے لیے اگرچیکہ یہ اقرار معتبر نہیں ہے مگر دیت وتعزیر کے لیے اس کا اعتبار کیا جائے گا (دیکھئے ردالمحتار ۱۰۸/۶، ۱۰۹)

مگر یہ سختی اسی حد تک جائز ہے جب تک وحشیانہ حد تک نہ پہنچے، اسی لیے فقہاء نے مجرموں کے ساتھ تادیبی معاملہ کو محدود کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

انما ھو السوط و الجن (کتاب الخراج لابی یوسف ۱۳۵)

مجرم کے لیے کوڑا ہے یا قید، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس لیے ایسی کسی بھی کارروائی کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو انسانی حدوں کو پار کرجائے اور جس سے مجرم کو شدید جسمانی نقصان پہنچے، فقہاء نے تو قیدخانہ میں سزا کے طور پر بھی وحشیانہ حرکتوں سے منع کیا ہے، چہ جائے کہ احتساب کے مرحلے میں۔ جبکہ ابھی سزا کا فیصلہ آنا باقی ہو۔

لہٰذا سزا کے طور پر ہو یا اعتراف جرم کے لیے درج ذیل کارروائیوں کی اجازت نہیں ہے:

❁ قیدیوں کو دھوپ میں کھڑا کرنا ❁ ان کے سر پر تیل ڈالنا ❁ داڑھی مونڈھنا ❁ کتے، بچھو یا اور کوئی درندہ جانور چھوڑنا (کتاب الخراج ۱۳۵، المغنی ۶۴۱/۷، تبصرۃ الحکام ۱۴۷/۲، الموسوعۃ ۳۲۸/۱۶) اس لیے کہ یہ خلاف شرع بھی ہے اور جسمانی نقصان کا باعث بھی۔

❁ قیدیوں کو بے لباس کرنا، اس لیے کہ ستر عورت ضروری ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۱۳/۴، الاحکام السلطانیہ للماوردی ۲۳۹)

❁ بھوکا پیاسا رکھنا ❁ جسم کے کسی حصہ کو آگ سے جلانا یا الکٹرک شاٹ لگانا ❁ پانی میں غوطے دینا۔ (السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ ۱۵۲، فتح الباری ۱۵۰/۶)

❁ سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا۔

❁ مسلسل جاگتے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لیے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا، ❁ چہرے پر مارنا ❁ گردن میں ناقابل برداشت بوجھ ڈال دینا ❁ زمین پر لٹاکر مارنا وغیرہ۔ (فتاویٰ ہندیہ ۴۱۴/۳، الاحکام السلطانیہ للماوردی ۲۳۹)

❁ قیدی کے خاندان کو گالی دینا یا سب وشتم کرنا (بدائع الصنائع ۶۴/۷)

❁ ناک، کان یا جسم کا کوئی حصہ کاٹنا یا توڑنا، یہ مثلہ ہے اور سخت ممنوع ہے، وغیرہ (بدائع

الصنائع ۷/۲۰) اور ہر وہ کام جو خلاف شرع ہو یا جس سے جسم کو کلی یا جزوی نقصان پہنچے۔

”قیدی کو بیڑی ڈالنا“

۴- قیدیوں کو فرار سے بچنے کے لیے زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، ان کو ہتھکڑی بھی پہنائی جاسکتی ہے۔ بیڑی بھی ڈالی جاسکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک ملزم کو ہتھکڑی لگا کر لایا گیا۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰/۲۱۷) نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک ملزم کے بارے میں فرمایا (جس پر چوری کا الزام تھا اور وہ کہتا تھا کہ میں نے اسے خریدا ہے) فاشدده فی السجن وثاقا ولا تحله حتی یاتیه امر الله، اس کو قید خانہ میں مضبوط باندھ دو اور معاملہ کی تحقیق تک نہ کھولو۔ (المحلی لابن حزم ۱۱/۱۳۱)

لیکن ایسا وقتی طور پر کرنے کی اجازت ہوگی، ان چیزوں کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھنا درست نہیں، اس لیے کہ ان حالتوں میں بنیادی ضروریات بھی پوری کرنی دشوار ہو جاتی ہے۔ فقہاء نے قیدیوں کو قضائے حاجت سے روکنے کی اجازت نہیں دی ہے، اسی طرح ایسی تنگ جگہ میں رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی ہے جہاں ایک دوسرے سے بے پردگی ہو، یا وضو اور نماز جیسی ضروریات پوری نہ کی جاسکتی ہوں۔ (الشرح الکبیر....۳/۲۸۲، درمختار مع الحاشیہ ۵/۳۷۸، ۳۷۹)

”قید تنہائی“

۵- حاکم کی اگر رائے ہو تو کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے، الموسوعۃ میں مبسوط سرخسی، ابن عابدین، فتاویٰ ہندیہ حاشیہ دسوقی، حاشیہ قلیوبی اور دیگر بہت سی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے:

ویجوز للحاکم عزل السجین وحبسه منفردا فی غرفة یقفل علیه بابها، ان کان فی دلك مصلحة. (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۱۹)

”قیدیوں سے جبری کام لینا“

۶- (الف): فقہاء شافعیہ وحنابلہ نے قیدیوں کو اجرت پر کام کرنے کی اجازت دی ہے، تاکہ وہ اپنے گھریلو اخراجات یا قرض وغیرہ کی ادائیگی کا انتظام کرسکیں۔ (الموسوعۃ الفقیہ ۱۶/۳۲۱ بحوالہ رسی المطالب مع حاشیہ الرملی ۲/۱۸۸، المغنی ۴/۴۹۵، ہندیہ ۳/۴۱۸)

(ب): لیکن حنفیہ کا مسلک معتمد اور دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو بااجرت کام

کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی، ورنہ قید خانہ کی ساری معنویت ہی ختم ہوجائے گی، قید خانہ اس کے لیے دوکان یا کارخانہ کی طرح بن جائے گا، اور قید کا مقصد فوت ہوجائے گا۔ (ابن عابدین ۲۷۸/۵، فتاویٰ ہندیہ ۴۱۸/۳)

(ج) تیسری رائے جس کو کویت کے لجنۃ الفقہاء نے اختیار کیا ہے کہ یہ حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۲۲/۱۶)

دوسری اور تیسری رائے کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کی اگر رائے ہو تو سزایافتہ قیدیوں سے بلا اجرت جبری کام لیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کام ان کی طاقت سے باہر نہ ہو، اور ان کی صلاحیت اور ذوق سے ہم آہنگ ہو، البتہ جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے، ان کا معاملہ اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہئے۔

”ملزم اور مجرم کا فرق“

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے، اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہوچکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے ان میں فرق کرنا ضروری ہے، یہی عدل کا تقاضا ہے، ورنہ سزایافتہ اور غیر سزایافتہ کا فرق باقی نہ رہے گا۔ اسی لیے بہت سے فقہاء نے دونوں قسم کے قیدیوں کے لیے الگ الگ قید خانہ یا قید خانہ میں الگ الگ حصہ مقرر کرنے کی ہدایت کی ہے۔ قرافی، ماوردی، زبیری اور حنابلہ کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ زیر سماعت ملزمین کو قید کرنے کا اختیار صرف حاکم کو ہے، عدالت کو نہیں، عدالت صرف انہی ملزمین کو قید کرسکتی ہے، جن کے لیے سزائے قید کا فیصلہ ہوچکا ہو، پہلی قسم کے قید خانہ کو ”سجن الوالی“ اور دوسری قسم کے قید خانہ کو ”سجن القاضی“ کہا جاتا تھا، اگرچہ کہ بعد میں دونوں قسم کے اختیارات عدالت ہی کو دے دیے گئے، اور عدالت دونوں قسم کے ملزمین کو قید کرنے کی مجاز ہوگی، لیکن فقہاء کی رائے کے مطابق کم از کم دونوں کے لیے قیام اور سلوک میں امتیاز کرنا ضروری ہے، تاکہ ظلم وزیادتی کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۱۸/۱۶، ۳۱۹، حاشیہ ابن عابدین ۳۷۸/۵، ۴۹۹، تبصرۃ الحاکم ۳۰۴/۱، لسان الحکام ۲۵۱، الاحکام السلطانیہ للماوردی ۲۱۹)

”ملزم کے قید کی مدت“

۸- زیر سماعت قیدیوں کو فیصلہ سے قبل اتنے دنوں تک قید میں رکھنا جو ان کے اوپر عائد فرد

جرم کی اصل سزا ہے، درست نہیں، بعض فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ ایسے مقدمات میں جن کی آخری سزا ہی قید ہوسکتی ہو، ملزم کو قید کرنے کی اجازت نہیں دیتے، اس لیے کہ فیصلہ وسزا سے قبل سزا کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن جو فقہاء (اور اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے) قید کی اجازت دیتے ہیں، بشرطیکہ ملزم مجہول الحال ہو اور صلاح وتقویٰ میں معروف نہ ہو، ان میں زیادہ تر فقہاء نے فیصلہ سے قبل قید کی مدت کو حاکم کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، مگر کچھ نے اس کی مدت ایک ماہ (ردالمحتار ۱۰۸/۶) کچھ نے ایک دن، بعض نے دو یا تین دن، اور مالکیہ نے ایک سال سے کم مقید کی ہے۔

(الموسوعۃ الفقہیہ ۲۹۴/۱۶، ۲۹۵)

دراصل یہ مدت عدالتی کارروائی کو چاک و چوبند کرنے کے لیے ہے، کسی عدالت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی غفلت و ناکامی کا بدلہ بے قصور ملزموں سے لے، اور اپنی سست رفتار کاروائی کی بنا پر ملزموں کو برسوں جیل میں بے یارو مددگار چھوڑ دے، جبکہ اس کا امکان بھی موجود ہے کہ ملزم نتیجتاً بے قصور ثابت ہو۔

”ملزم اگر بری ثابت ہو“

۹- اگر زیر سماعت ملزم کو قید میں رکھا گیا، اور بعد میں عدالت نے اسے بری قرار دیا، تو وہ زمانۂ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی نقصان کا ہرجانہ طلب کرنے کا مجاز نہیں ہے، بشرطیکہ قید کی مدت معروف اصولوں کے مطابق ہو، اور اس دوران اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک بھی نہ کیا گیا ہو، اس لیے کہ جس حد تک قید کی فقہاء نے اجازت دی ہے، وہ ان نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے دی ہے، اور اسی لیے ملزم کے حالات کے لحاظ سے زمانۂ قید میں کمی بیشی روا رکھی گئی ہے۔

”قیدی کو رابطہ کی اجازت“

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کا مکمل حق حاصل ہے، اس لیے کہ حراست کا مقصد تحقیق حال ہے، اگر قیدی کو اپنے معاملہ میں رابطہ اور بیان صفائی کا اختیار نہ دیا جائے تو حقیقت حاصل کیسے واضح ہوسکتی ہے؟ بلکہ اگر قیدی پر کچھ دوسرے اور مقدمات بھی ہوں تو ان کے لیے بھی بطور خود یا بذریعہ وکیل عدالتی کارروائی کے لیے اس کو نکلنے کی اجازت دی جائے گی، صرف اتنی دیر کہ زیر بحث مقدمہ کی اس سے متعلق کارروائی مکمل ہوجائے۔

(درمختار مع ردالمحتار ۳۷۸/۵، ۴۹۹، لسان الحکام لابن الشحنۃ ۲۵۱، تبصرۃ الحکام ۳۰۴/۱، المغنی ۲۰۷/۹، الموسوعۃ الفقہیہ ۳۲۶/۱۶)

قیدی خواتین کے شیر خوار بچے

۱۱-خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ ایسے شیر خوار بچوں کو جو ماں کے بغیر نہ رہ سکتے ہوں، جیل میں رکھنے کی اجازت ہوگی، یہی شرعی اصولوں کا تقاضہ ہے، اس لیے کہ ماں کے جرم کی وجہ سے بچوں کو ماں کی ممتا سے محروم رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، علاوہ ازیں بچوں کی علاحدگی خود قیدی خواتین کے لیے بھی مسلسل ذہنی اذیت کا باعث ہوگی، اس سلسلے میں بعض احادیث وآثار سے کافی روشنی ملتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے (جنگ میں پکڑی جانے والی خواتین کے بارے میں جن کو باندی بنالیا گیا ہو، اوران کے ساتھ چھوٹا بچہ ہو) ارشاد فرمایا:

۞ لاتوله والدة عن ولدها (رواہ البیہقی ،نصب الرایۃ ۳/۲۶۶)

ترجمہ: ماں کو اپنے بچہ سے الگ نہیں کیا جائے گا۔

۞ ایک روایت میں ارشاد گرامی اس طرح نقل کیا گیا ہے:

من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين احبته يوم القيامة (بیہقی ۹/۱۲۶، دارقطنی ۳/۶۷)

ترجمہ: جوشخص ماں کو اس کے بچہ سے الگ کرے گا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دوستوں سے الگ کردے گا۔

۞ حضرت عبادة ابن الصامت روایت کرتے ہیں کہ:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يفرق بين الام وولدها فقيل يا رسول الله (ﷺ) الى متى؟ قال حتى يبلغ الغلام و تحيض الجارية. (سنن دارقطنی ۳/۶۷)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ماں کو اس کے بچہ سے الگ کرنے سے منع فرمایا، آپ ﷺ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ کب تک؟ ارشاد فرمایا کہ جب تک لڑکا بالغ نہ ہو جائے اور لڑکی کو حیض نہ آجائے۔

۞ حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ملعون من فرق بين والدة وولدها (حاکم ۲/۵۵، دارقطنی ۳/۶۷)

ترجمہ: وہ شخص ملعون ہے جو ماں کو اپنے بچہ سے الگ کردے۔

❁ حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں:

وهب لی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم غلامین اخوین فبعث احدها فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یا علي ما فعل غلامك؟ فاخبرته فقال رده رده.

(ابوداؤد حدیث نمبر ۲۶۹۶، ترمذی حدیث نمبر ۱۲۸۴، حاکم ۲/۵۵، دار قطنی ۳/۶۶)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے مجھے دو غلام عطا فرمائے جو دونوں بھائی تھے، میں نے ان میں سے ایک کو فروخت کردیا رسول اللہ ﷺ نے ایک دن غلاموں کے بارے میں دریافت فرمایا تو میں نے بیچنے کے بارے میں بتادیا تو آپ نے فرمایا کہ واپس کرو۔

❁ ایک مشہور حدیث سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا فلیس منا (مسند احمد ۱/۲۵۷، ترمذی حدیث ۱۹۲۱)

ترجمہ: جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

ان احادیث کا مقتضایہ ہے کہ قیدی خواتین کو ان کے شیر خوار بچوں سے الگ نہ کیا جائے۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق اعتراضات کا جائزہ

(۲)

از: ڈاکٹر مفتی محمد شمیم اختر قاسمی

سلاطین ہند کا عدل وانصاف اشاعت دین کا سبب بنا:

یہ بات درست ہے کہ سلاطین ہند علما، صوفیاء اور مشائخ کی طرح دین اسلام کے نمائندے نہ تھے، مگراس سے بھی مفر نہیں کہ ان کا ہر اقدام دین کے منافی نہ تھا، یا ان کا فکر کلی طور پر اسلام کے اصول ومبادی سے متضاد ومتصادم تھا۔ اگر ان سلاطین میں بہت سے نااہل تھے تو بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو دینی روح سے مزین اور عدل پرور تھے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کے حکمرانوں کے کارناموں، ان کی دینی خدمات، عدل پروری اور رعایا پروری کا موازنہ کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھتے ہیں:

''فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک نے سخاوت میں حضرت ابوبکر کی اور عدل میں حضرت عمر کی تقلید کرنے کی کوشش کی، حضرت بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں ہے کہ التمش کی طرف سے عام اجازت تھی کہ جو لوگ بھی فاقہ کرتے ہوں اس کے پاس لائے جائیں اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا اور ان کو قسمیں دے کر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ یہاں آکر عدل وانصاف کی زنجیر جو باہر لٹکی ہوئی ہے ہلائیں تاکہ وہ ان کے ساتھ انصاف کرسکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا باراس کی طاقت برداشت نہ کرسکے گی۔ غیاث الدین کے بارے میں مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ اپنی داد دہی اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ

کرتا اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کرلیتا، اس کے دل کو آرام نہ پہونچتا۔ انصاف کرتے وقت اس کی نظر اس پر نہ ہوتی کہ ظلم کرنے والا اس کا حامی و مددگار ہے۔ اس کے لڑکے، اعزہ مخصوصین، والی اور مقطع اس کی عدل پروری سے واقف تھے، اس لیے کسی کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کریں، اس کے عدل وانصاف کے قصے بہت مشہور ہیں، خود اس زمانہ کے ہندوؤں نے اس کی حکومت کو دل کھول کر سراہا ہے۔ ۱۳۳۷ بکرمی مطابق ۱۲۸۰ء کا ایک سنسکرت کتبہ پالم میں ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ بلبن کی سلطنت میں آسودہ حالی ہے۔ اس کی بڑی اور اچھی حکومت میں غور سے غزنہ اور دراوڑ سے رامیشورم تک ہر جگہ زمین پر بہار ہی بہار کی دل آویزی ہے، اس کی فوجوں نے ایسا امن وامان قائم کیا ہے جو ہر شخص کو حاصل ہے، سلطان اپنی رعایا کی خبرگیری ایسی اچھی طرح کرتا ہے کہ خود وشنو دنیا کی فکر میں آزاد ہوکر دودھ کے سمندر میں جا کر سو رہے ہیں۔ امیر خسرو علاء الدین خلجی کے بارے میں خزائن الفتوح میں لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت عمر کے ایسا عدل قائم کر رکھا ہے اور عوام کے معاملات میں وہ المستنصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے۔ محمد بن تغلق کے بارے میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے دور کے مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ عدل نوازی کے سلسلہ میں مشائخ اور علماء کی بھی رورعایت نہ کرتا، وہ اگر مجرم ہوتے تو ان کو بھی بلا تامل سزائیں دیتا۔ مسالک الابصار میں ہے کہ سلطان ہفتہ میں شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا اور اس کے افتتاح کے موقعہ پر ایک نقیب بلند آواز سے پکارتا تاکہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اہل حاجت اپنی ضرورتیں پیش کریں، جس کو کوئی شکایت ہو یا جو حاجت مند ہو وہ حاضر ہو جائے، نقیب کے خاموش ہوتے ہی اہل غرض بلا تکلف سامنے آجاتے اور سامنے کھڑے ہوکر نہایت صفائی سے حالات بیان کرتے، اثنائے بیان میں کسی کو کسی کے روکنے کی مجال نہ تھی۔ تاریخ مبارک شاہی اور ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ دونوں میں ہے کہ سلطان نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورے کرتا اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم ان کی فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کے گردن پر ہوگا۔ اس لیے مفتیوں سے کوئی فروگزاشت نہ ہوتی۔ موجودہ دور کے ہندو مؤرخین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کی حکومت عدل وانصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم وتعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں امن وسکون تھا، چیزوں کی فراوانی تھی، اعلیٰ وادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن تھے، عام رعایا قانع اور دولت مند ہوگئی تھی۔

سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی اس کو مغل بادشاہوں نے بھی اور بھی شاندار طریقے پر برقرار رکھا۔ بابر نے اپنی تزک میں خود لکھا ہے کہ اس کی فوج بھیرہ سے گزر رہی تھی تو اس کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے اور ان پر ہاتھ ڈالا ہے، تو فوراً ان سپاہیوں کو گرفتار کرکے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے روزانہ ڈیڑھ پہر عدل وانصاف کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جہاں گیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے روزانہ عوام کی شکایتیں سنتا، اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر لگا رکھی تھی تاکہ ہر شخص کسی روک ٹوک کے بغیر براہ راست اس سے فریاد کرسکے، وہ سفر میں بھی ہوتا تو روزانہ تین گھنٹے بیٹھ کر فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، علالت کے زمانہ میں بھی اس کا یہ معمول جاری رہتا۔ اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ ''مخلوق خدا کی نگہبانی کے لیے میں رات کو بھی جاگتا ہوں اور سب کے لیے اپنے آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔

وہ تو نور جہاں کو بھی ایک عورت کے شوہر کو ہلاک کرنے پر موت کی سزا دینے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ جیسا کہ مولانا شبلی کی نظم ''عدل جہاں گیری'' سے ظاہر ہوگا۔

مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہونچ سکتا تھا۔ جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہوکر خود اپنا استغاثہ پیش کردیتا، دربار کے عہدے دار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کردیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا اور پھر مناسب کاروائی کے لیے فیصلہ صادر کردیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا۔ شاہ جہاں نے گجرات کے ناظم حافظ محمد نصیر کو حبس دوام کی سزا اس لیے دی کہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ وہ ظالمانہ طریقہ پر پیش آتا تھا، اسی طرح ایک بار بنگال کے ناظم فدائی خاں کو اس کے عہدہ سے برطرف محض اس لیے کردیا کہ عوام اس کے شاکی تھے۔ اورنگ زیب کے ناقدین بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتے کہ وہ عدل پرور نہیں تھا، اس نے شاہ جہاں کو اس کی معزولی کے بعد ایک رقعہ میں لکھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور ان کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے نہ کہ تن پروری اور عیاشی۔

اور اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے انہوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا لیکن یہاں کہ غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں

کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور ہے اور مسلمانوں کو بھی اوامر ونواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی اور ان کی معاشرتی زندگی کو درہم برہم نہیں کیا۔ اکبر نے انسان دوستی کے جذبہ سے ستی کے رسم کو روکنے کی کوشش کی، کمسن بیواؤں کے رواج کو بھی ختم کردینا چاہا، بچپن کی شادی کے خلاف بھی کچھ عملی کارروائی کی، لیکن اپنی ہمدردانہ خواہشوں کو کبھی تلوار کی نوک سے عمل میں نہیں لایا۔ بعض فرماں رواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہورہے ہیں۔ ہندو مؤرخین لکھتے ہیں کہ یوپی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیرنگیں رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا اور جبری اشاعت اسلام نہیں ہوئی، اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں، اس رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ صوفیاء کرام نے خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہونچی ۔...لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جس سلاطین کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کے دور عروج کے اچھے حکمراں تھے، اگر ان میں واقعی یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو خون سے ہولی کھیلنے والے، ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑنے والے، اپنے سینوں کو نوک شمشیر اور نوک سنان سے چھلنی کرنے والے راجپوتوں کی سرزمین میں ان کا اور ان کے ہم مذہبوں کا قدم جمنا آسان نہ تھا۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی حکومت کے دور عروج میں زیادہ تر اچھے حکمراں گزرے۔

غلام سلاطین میں آرام شاہ، رکن الدین فیروز شاہ، معزالدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ اور کیقباد جیسے بے جان حکمراں بھی گزرے۔ لیکن اسی خاندان میں التمش کی نیک نفسی اور انتظامی کارکردگی، بلبن کے جاہ وجلال اور عدل گستری کی بدولت حکومت کو غیر معمولی قوت حاصل ہوئی۔ خلجی سلاطین کے عہد میں قطب الدین مبارک شاہ جیسا رند اور ناصر الدین خسرو جیسا مفسد حکمراں بھی ہوا، لیکن ان کے عہد کی بدعنوانیاں اور کمزوریاں ان کے پیش رو سلطان علاء الدین خلجی کی نبرد آزمائی اور رعایا پروری سے دب کر رہ گئیں، ان کے خاندان کو تو ان سے نقصان پہونچا لیکن حکومت برقرار رہی۔ غیاث الدین کی مردانگی اور فرزانگی، محمد تغلق کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی اور

فیروز شاہ کی غیر معمولی رحم دلی اورعیت نوازی سے جوقوت بنی اس کے سہارے ان کے کمزور جانشیں کچھ عرصہ تک حکومت کرتے رہے۔ابراہیم لودھی کواپنی کمزوریوں کانتیجہ بھگتنا پڑا۔ان میں سے اچھے سلاطین کی اچھائیوں کاذکر کرنے میں جس طرح منہاج سراج (مولف طبقات ناصری) مولانا ضیاء الدین برنی (صاحب تاریخ فیروز شاہی) اورشمس سراج عفیف (کاتب تاریخ فیروز شاہی) نے فیاضی سے کام لیاہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندومؤرخین میں کے۔ایس۔لعل۔ نے اپنی تاریخ ہسٹری آف دی خلجیز،ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف قرونہ ٹرکس اورڈاکٹرایشورٹوپانے پولی ٹکس ان پری مغل ٹائمس میں قابل قدر سلاطین کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

مغل خاندان کے پہلے چھ بادشاہوں کے حربی،سیاسی،اقتصادی اورتمدنی کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس خاندان کے آخری ۱۳؍نااہل اورنالائق حکمراں انہیں شاندار کارناموں کی بدولت ڈیڑھ سو برس تک تخت وتاج کے مالک بنے رہے،اور جس طرح نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری،ابوالفضل نے اکبرنامہ،مستعدخان نے اقبال نامہ جہانگیری،ملاعبدالحمیدلاہوری نے بادشاہ نامہ لکھ کر مغل بادشاہوں کے قابل قدر حکمرانوں کی مدح سرائی کی ہے،اسی طرح موجودہ دور کے ہندومؤرخوں میں ڈاکٹررام پرشادترپاٹھی نے رائیز آف دی مغل ایمپائر،ڈاکٹربینی پرشادنے ہسٹری آف جہانگیراور بنارسی پرشادنے ہسٹری آف شاہ جہاں لکھ کراپنے اپنے نقطہ نظر سے ان حکمرانوں کوخراج تحسین اداکیاہے۔البتہ عالم گیر کی تعریف وتوصیف میں جس طرح عالمگیر نامہ کے مصنف کاظم شیرازی کاقلم چلاہےاس طرح سرجادوناتھ سرکار جیسے دیدہ ورمؤرخ نے اس بادشاہ کی تاریخ لکھنے میں بیس برس کی مدت گزاری اوربڑی کدوکاوش کے بعداس کی تاریخ ۵؍جلدوں میں مرتب کی آج تک کسی ''نااہل بادشاہ'' کی تاریخ اتنی جلدوں میں نہیں لکھی گئی۔'' (۶۳)

بدقسمتی سے ہندوستان کی وسطیٰ اورجدیدتاریخ کے واقعات وکردارکواس طرح سے مسخ کردیا اورجھوٹ سے بھردیا گیاہے کہ غلط اوردروغ بیانی کوالوہی صداقت کی طرح قبول کرلیا گیاہے،اور جولوگ حقیقت اورفسانہ میں اصلیت اور بناوٹ میں سچ اورجھوٹ میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے انہیں کوبدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس طرح سے فرقہ واریت سے ناجائز فائدہ اٹھانیوالوں کا تاریخ کومسخ کرنے اوردروغ آمیز بنانے کا کام جاری ہے،اور بالعموم اس طرح کے منافقانہ اورسیاسی رہنماؤں کی سرپرستی وقیادت ہی میں انجام پاتے ہیں،چنانچہ اس

سیاسی متعصّبانہ نظریہ پر سخت تنقید کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس اجلاس منعقدہ مدارس (دسمبر ۱۹۴۴ء) کے خطبہ صدارت میں کہا تھا کہ:

''پالیٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے ہندوستان کا مشہور پھل پھوٹ پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کی برائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتیں کہی جاسکتی تھیں، مگر ان کے بعد اس ملک میں جو حکومت آئی اس کے زمانہ میں تعلیم کا سررشتہ پورا کا پورا غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا، ان لوگوں کے ہر جتھے کی ہر طرف سے یہ کوشش تھی کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی کے دل میں بٹھادے اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کرے جس سے ان کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جٹنے نہ پائیں۔ تعلیم کے سارے مضمونوں میں اس کام کے لیے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ انھوں نے ملک کے لیے تاریخ کی جو کتابیں شروع سے آخر تک لکھیں اور پڑھائیں ان میں یہی باتیں سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائیں کہ جو دل ان سے ٹوٹے تھے وہ پھر اب تک جٹ نہ سکے... ہندوستانی ہی کورس کی کتابیں بتاتے ہیں اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہوں کے حالات کی تحقیق پر کتابیں لکھاتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے جو ان کے پہلے پرانی بدیسی بنا کر چھوڑ گئے۔'' (۶۴)

خلاصۂ بحث:

عام رجحان یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین نے ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا، متعصب مؤرخوں نے اس کے برعکس یہ باور کرایا ہے کہ انھوں نے جبراً اسلام کو پھیلایا۔ دعوت اسلام کے مصنف آرنلڈ نے اشاعت اسلام کا پورا سہرا صوفیاء کے سر ڈالا۔ (۶۵) اسی رائے کو زیادہ تر لوگوں نے قبول کر کے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ عصر حاضر کے کچھ محتاط مؤرخوں نے اپنی تمام بحث اس بات پر مرکوز کردی ہے کہ اسلام کی اشاعت صوفیائے کرام کی ترجیحات یا عمومی ذمہ داریوں سے خارج تھی اور انھوں نے کوئی عملی جدوجہد نہ کی۔ (۶۶) اسی طرح ایک اور مؤرخ نے اپنے ایک طویل مضمون میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں علماء قدیم نے

کوئی نمایاں سرگرمی نہیں دکھائی، ان کا دائرہ کار صرف تعلیم و تعلم اور کتاب لکھنا رہا ہے۔ دین کی تبلیغ کم از کم قرون وسطی کے برصغیر کی حد تک ان کے فرائض اور کاموں میں شامل دکھائی نہیں دیتی، البتہ کہیں کہیں چند مثالیں مل جاتی ہیں جو انگلیوں کی پوروں پر گنی جاسکتی ہیں۔(۶۷)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نیک کام کو ہندوستان کی حد تک کس نے انجام دیا، عوام نے یا صرف تجار نے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین، صوفیا، علما، عرب تجار اور کسی حد تک عام مسلمان بھی شامل ہیں اور سبھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ سلاطین نے ملک فتح کرکے یہاں کے باشندوں کو ایک مرکز سے جوڑا اور مسلمانوں کو ان کے درمیان رہنے کا موقع فراہم کیا جن کی معاشرت، تہذیب اور عادات واطوار سے مقامی باشندے متأثر ہوئے اور اس طرح گاہے بہ گاہے وہ مسلمان معاشرہ میں اسلام قبول کرکے ضم ہوگئے۔ دوسری طرف ان بادشاہوں نے جب کسی علاقہ پر فتح حاصل کی تو ان کے سامنے قبول اسلام کی پیش کش رکھی جس کو بہت سے ہندوؤں نے قبول کیا۔ اس کے بعد پھر یہی سلاطین مقامی باشندوں کو اعزاز واکرام سے نوازتے جس کے اچھے اثرات پڑے جس کی آخری شکل حلقہ اسلام میں شمولیت تھی۔ اگر مسلمان ہندوستان میں سیاسی افق پر کمزور ہوتے تو بقول ایک ہندو دانشور کہ یہ بھی امکان تھا کہ ہندی ادیان کے گھنے جنگل میں اسلام کی شخصیت ہی گم ہوجاتی قطع نظر اس کے مسلمانون کی تعداد کتنی ہوتی؟(۶۸)

اگر یہ تمام باتیں نہ ہوتیں تو پھر صوفیائے کرام جو سلاطین وقت سے الگ تھلگ ہوکر دین کی دعوت کو عام کیے ہوئے تھے کیسے اور کیوں کر یہاں آتے اور کون انہیں اپنے کفرستان میں قال اللہ وقال الرسول کی آواز بلند کرنے کی اجازت دیتے، جسے سن کر دیکھ کر اور ان کے کشف وکرامات سے متاثر ہور کر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا جس کی تعداد کا کوئی حتمی ریکارڈ تو نہیں ملتا البتہ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں ایسے واقعات بکھرے پڑے ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان پاک نفوس کی برکت اور ان کی مساعی سے بے شمار لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ سید عابد حسین نے صوفیائے کرام اور مبلغین عظام کے تبلیغی مشن کے سلسلے میں جو نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ بجا معلوم ہوتا ہے:

> ”حضرات صوفیا نے اپنے طور پر اس کام کا بیڑا اٹھایا، مگر ان کی راہ میں بڑی مشکلیں حائل تھیں، ملک کا نہایت وسیع اور زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قریوں پر مشتمل

ہونا جو بعض علاقوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے، آمدورفت کی دشواریاں، بدامنی، جنگ وجدل، اس کے علاوہ ہندو مذہب کی جڑیں مضبوطی سے لوگوں کے دلوں میں قائم تھیں، اگرچہ مسلمانوں کا معاشرتی نظام جس میں ابھی تک اخوت ومساوات کا کچھ رنگ باقی تھا، ہندوؤں کے نچلے طبقے کو اپنی طرف کھینچتا تھا، لیکن ان کی قدامت پسندی اور وہ وحشت جو اجنبی فاتح قوم سے ہوا کرتی ہے انہیں روکتی تھی۔ اونچے طبقے عموماً اپنے مذہب سے مطمئن تھے اور اپنی سماجی حالت سے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ صوفیوں کی جماعت نے ان ناسازگار حالات میں عام طور پر بغیر حکومت کی مدد کے محض اپنے جوش ایمانی سے تبلیغ کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی، لاکھوں کروڑوں ہندو جن میں اونچے طبقے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے مسلمان ہوگئے۔ پھر بھی مسلمانوں کی تعداد غیرمسلموں کے مقابلے میں اس قدر کم رہی کہ ریاست کے لیے یک جہتی اور ہم آہنگی کی جو فضا درکار ہے وہ پیدا نہ ہوسکی۔'' (۶۹)

علمائے کرام نے بھی یقیناً خالص دینی جذبے کے تحت ہی اسلامی تعلیمات کو ہندوستان کے کونے کونے میں عام کیا۔ دراصل یہ علماء ایک ایسی کڑی کا کام انجام دے رہے تھے جس کے تانے بانے ایک طرف سلاطین وقت سے ملتے تھے تو دوسری طرف صوفیاء اور مشائخ کی خانقاہوں سے۔ مسئلہ صرف قبول اسلام تک محدود نہیں بلکہ ان کی تعلیم وتربیت اور دینی فہم کی بھی ضرورت تھی جس کے لیے یہ علماء کرام تھے۔ ان کی تعلیم وتدریس کے ذریعہ پرورش وپرداخت کرتے تھے۔ اسی طرح مناظرے کی گرم بازاری نے بھی اسلام کو وسعت دینے میں کافی تقویت پہونچائی ہے۔

اسی طرح عرب تجار نے بھی ملک کے ایک حصے میں اپنے اخلاق وکردار اور صفائی معاملات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت میں کوشاں تھے۔ اگر صرف انہیں لوگوں کو اسلام کی اشاعت کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے تو پھر شمالی ہند کے لوگوں کو کس بات نے مجبور کیا کہ وہ اسلام قبول کریں۔

دراصل یہ کام ہندوستانی تناظر میں کسی ایک اہم آدمی کے ذریعہ ہرگز انجام نہیں پاسکتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اسلام کی اشاعت میں مذکورہ تمام لوگوں نے حصہ لیا، جن کی بے لوث خدمات اور مساعی کو تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ان تمام لوگوں کی خدمات کا غیرجانبدارانہ طریقے سے مطالعہ کریں اور جن لوگوں نے اس کام کو سلاطین کے خانے سے

بالکل خارج کردیا ہے ان سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد دواہم سلطنت اموی اور عباسی وجود میں آئی کیا وہ دین کے نمائندہ تھے اور انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے کتنے غیرمسلموں کو مسلمان بنایا۔ انھوں نے اقتدار کے حصول کے لیے جو جھگڑے اور مناقشے کیے کیا وہ بھی دینی جذبہ کے تحت تھے؟ سیاست اور مذہب کو الگ رکھ کر ہی ان خلفاء کی دینی مساعی کو سمجھا جاسکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام واستحکام کے بعد ان سلاطین نے مذہب سے بیزاری یا دلچسپی کا کس حد تک مظاہرہ کیا اور اسلامی اقدار وتہذیب کو فروغ دینے میں کوتاہی یا لاپرواہی تو نہیں کی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سلاطین ہند نے اپنے اپنے عہد میں اسلامی اقدار وتہذیب کو بڑی حد تک فروغ دیا۔ چند رسومات ہند کو اپنا کر انھوں نے رواداری کے اصول پر ہی عمل کیا۔

رہی بات جبری اشاعت اسلام کی تو اس پورے بحث میں اسی بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کی اشاعت جبراً ہرگز نہیں ہوئی۔ جبر سے لوگوں پر قابو تو پایا جاسکتا ہے مگر دلوں کو ہرگز فتح نہیں کیا جاسکتا اور اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی کہ جب جب مسلمانوں کا اقتدار کمزور پڑا یہاں کے نومسلم اسلام سے پھر جاتے، دو چند واقعات کے استثنا کے ساتھ تاریخ میں مزید کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ انگریزی عہد میں مسلمان بالکل مغلوب ہوگئے تھے اور اسلام کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی تھی باوجود اس کے اس عہد میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ آسمان سے ٹپک کر آنے والے نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے ہی باشندے تھے اور غیرمسلم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان فرمارواؤں نے بڑی حد تک کوشش کی کہ مذہبی رواداری سے قطع نظر نہ کیا جائے۔ ان کے عہد میں مندر توڑے جانے کی شہادت کا پس منظر بس اتنا ہے کہ وہ عموماً جنگ کے دوران توڑے گئے جن میں بہت سے منادر کی بعد میں دوبارہ تعمیر بھی کردی گئی۔

مجموعی طور پر مسلمان حکمراں امن وامان قائم رکھتے تھے، انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور انھوں نے ہندو رعایا کو مذہبی اور تہذیبی آزادی دے رکھی تھی، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ریاست کا قانون بدل کر اسلامی قانون رائج کردیا تھا، لیکن ہندوستان میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ حکمران طبقہ اپنا مذہبی قانون جاری کرے۔ ہندو اور بدھ فرماں روا بھی یہی کرتے آرہے تھے۔ بلکہ سلاطین دہلی نے تو اتنی رواداری برتی کہ صرف قانون عام جاری کیا اور شخصی ومذہبی امور میں ہندوؤں کے دھرم شاشتروں کے اصول کو جاری رکھا اور اس کے نفاذ میں مدد دینے کے لیے ملک کی مرکزی عدالت اور صوبوں کی عدالتوں میں پنڈت مقرر کیے۔ اگر کوئی بادشاہ ہندو رعایا پر بے

جا سختیاں کرتا تو وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی تھی جو عموماً خود حکمراں یا اس کے خاندان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا۔(۷۰)

ماخذ و مراجع

(۶۳) ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۱۰۹-۱۱۴۔ اسلام، مسلمان اور غیر مسلم، ص:۲۹-۳۳

(۶۴) مقالات سلیمانی، ص:۳۸۱-۳۸۷، ج:۱

(۶۵) ٹی، ڈبلو، آرنلڈ، دعوت اسلا (مترجم اردو: محمد عنایت اللہ) ص:۲۷۱-۳۱۴، مطبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء

(۶۶) سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء ص:۱۹-۴۶، مضمون: برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، مضمون نگار: ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی

(۶۷) سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۸۷ء ص:۴۵-۶۸، مضمون: برصغیر میں اشاعت اسلام، مضمون نگار: پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی

(۶۸) این۔سی۔مہتا، ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، ص:۱۰، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء

(۶۹) سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص:۲۷-۳۷، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء

(۷۰) ایضاً، ص:۶۷-۷۷

عمل بالقرآن

از: مفتی محمد اسماعیل طورو
جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ صدر راولپنڈی

بعض نو ماہ کا کورس کرا کر لڑکا یا لڑکی کو فارغ کر دیتے ہیں۔ اگر چہ عالم سے قرآن سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ قرآن کی تفسیر و ترجمہ پڑھانے اور مدرس کیلئے بنیادی علوم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر علم چاہتے ہو تو قرآن پاک کے معانی میں غور وفکر کرو کہ اس میں اولین وآخرین کا علم ہے۔

مگر کلام پاک کے معنی کے لئے جو شرائط وآداب ہیں ان کی رعایت ضروری ہے یہ نہیں کہ ہمارے زمانہ کی طرح سے جو شخص عربی کے چند الفاظ کے معنی جان لے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بغیر کسی لفظ کے معنی جانے اردو ترجمہ دیکھ کر اپنی رائے کو اس میں داخل کر دے۔ حضور اکرم ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ جو شخص قرآن پاک کی تفسیر میں اپنی رائے سے کچھ کہے اگر وہ صحیح ہو تب بھی اس نے خطا کی مگر آج کل کے ''روشن خیال'' لوگ قرآن پاک کی ہر آیت میں سلف کے اقوال کو چھوڑ کر نئی بات پیدا کرتے ہیں ہمارے زمانہ میں ہر روشن خیال اس قدر جامع الاوصاف اور کامل ومکمل بننا چاہتا ہے کہ وہ معمولی سی عربی عبارت لکھنے لگے بلکہ صرف اردو عبارت دلچسپ لکھنے لگے یا تقریر برجستہ کرنے لگے تو پھر وہ تصوف جنید وشبلی کا استاد ہے فقہ میں مستقل مجتہد ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر میں جو نئی سے نئی بات دل چاہے گھڑے نہ اس کا پابند کہ سلف میں سے کسی کا یہ قول ہے یا نہیں، نہ اس کی پروا کی نبی کریم ﷺ کے ارشادات اس کی نفی تو نہیں کرتے، وہ دین میں مذہب میں جو چاہے کہے جو منہ میں آئے بکے کیا مجال ہے کہ کوئی شخص اس پر نکیر کر سکے یا اس کی گمراہی کو واضح کر سکے، جو یہ ہے کہ یہ بات اسلاف کے خلاف ہے وہ لکیر کا فقیر ہے، تنگ نظر ہے، پست خیال ہے، تحقیقات عجیبہ سے عاری ہے۔ لیکن جو یہ کہے کہ آج تک جتنے اکابر نے اسلاف نے جو

کچھ کہا وہ سب غلط ہے اور دین کے بارے میں نئی بات نکالے وہ دین کا محقق Researcher ہے۔ حالانکہ اہل فن experts نے تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے مختصراً عرض کرتا ہوں جس سے معلوم ہوجائے کہ بطن کلام پاک تک رسائی ہر شخص کو نہیں ہوسکتی۔

❁ اول لغت، جس سے کلام کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہوجاویں، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو جائز نہیں کہ بدون معرفت لغات عرب کے کلام پاک میں کچھ لب کشائی کرے اور چند لغات کا معلوم ہوجانا کافی نہیں، اس لئے کہ بسا اوقات لفظ چند معانی میں مشترک ہوتا ہے اور وہ ان میں سے ایک دو معنی جانتا ہے اور فی الواقع اس جگہ کوئی اور معنی مراد ہوتے ہیں۔

❁ دوسرے نحو جاننا ضروری ہے اس لئے کہ اعراب زیر زبر پیش کی تبدیلی سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں اور اعراب کی معرفت نحو پر موقوف ہے۔

❁ تیسرے صرف کا جاننا ضروری ہے، اس لئے کہ بناء اور صیغوں کے اختلاف سے معانی بالکل مختلف ہوجاتے ہیں۔ ابن فارس کہتے ہیں کہ جس شخص سے علم الصرف فوت ہوگیا اس سے بہت کچھ فوت ہوتا ہے۔ علامہ زمخشری اعجوبات تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے قرآن پاک کی آیت یوم ندعو کل اناس بامامھم (جس دن کہ پکاریں گے ہم ہر شخص کو اس کے مقتدی اور پیش رو کے ساتھ) اس کی تفسیر صرف کی ناواقفیت کی وجہ سے یہ کی جس دن پکاریں گے ہر شخص کو ان کی ماؤں کے ساتھ۔ امام کا لفظ جو مفرد تھا اس کو ام کی جمع سمجھ لیا۔ اگر وہ صرف سے واقف ہوتا تو معلوم ہوجاتا کہ ام کی جمع امام نہیں آتی۔

❁ چوتھے اشتقاق (کسی لفظ کا کسی لفظ سے نکلنا) کا جاننا ضروری ہے اس لیے کہ لفظ جبکہ دو مادوں سے مشتق ہو تو اس کے معنی مختلف ہوں گے جیسا کہ مسیح کا لفظ ہے کہ اس کا اشتقاق مسح سے بھی ہے جس کے معنی چھونے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہیں اور مساحت سے بھی ہے جس کے معنی پیمائش کے ہیں۔

❁ علم معانی کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کی ترکیب معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہے۔

❁ چھٹے علم بیان کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کا ظہور وخفا، تشبیہ وکنایہ معلوم ہوتا ہے۔

❁ ساتویں علم بدیع کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ تینوں فن علم بلاغت کہلاتے ہیں مفسر کے اہم علوم میں سے ہیں اس لئے کہ کلام پاک

جوسرا سرا عجاز ہے اس سے اس کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔

❁ آٹھویں علم قرأت کا جاننا بھی ضروری ہے اس لئے کہ مختلف قراءتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں اور بعض معنی ترجیح preference معلوم ہو جاتی ہے۔

❁ نویں علم عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ کلام پاک میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جس کے ظاہری معنی کا اطلاق حق سبحانہ وتقدس پر صحیح نہیں۔ اس لیے ان میں کسی تاویل کی ضرورت پڑے گی جیسے يد الله فوق ايديهم.

❁ دسویں اصول فقہ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ جس سے وجوہ استدلال و استنباط معلوم ہوسکیں۔

❁ گیارہویں، اسباب نزول کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ شان نزول سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوں گے اور بسا اوقات معنی کا معلوم ہونا بھی شان نزول پر موقوف ہوتا ہے۔

❁ بارہویں، ناسخ ومنسوخ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ منسوخ شدہ احکام معمول بہا سے ممتاز ہوسکتے ہیں۔

❁ تیرہواں علم فقہ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں۔

❁ چودہواں علم ان احادیث کا جاننا ضروری ہے جو قرآن پاک کی مجمل آیات کی تفسیر میں واقع ہوئی ہیں۔

❁ ان سب کے بعد پندرہواں علم وہبی ہے جو حق سبحانہ وتقدس کا عطیہ خاص ہے اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتا ہے جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے۔ ”من عمل بما علم ورثة الله علما مالم يعلم“ بندہ اس چیز پر عمل کرتا ہے جس کو جانتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ ایسی چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا۔

اہل اصول نے لکھا ہے کہ شریعت پر عمل کرنے کے لیے اس کے اصول کا جاننا ضروری جو قرآن، حدیث اور اجماع ہے اور چوتھا قیاس جو ان سے ہی مستنبط ہے۔ پھر قرآن پاک پر عمل کرنے کے لیے چار چیزوں کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ پہلا نظم قرآنی، صیغہ اور لغت کے اعتبار سے۔ اس کی بھی چار قسمیں ہیں خاص، عام، مشترک، مئول۔

دوسری قسم وجوہ بیان، اس کی بھی چار قسمیں ہیں: ظاہر، نص، مفسر، محکم، اور چار قسمیں ان

کے مقابل خفی، مشکل، مجمل، متشابہ۔

اور تیسری قسم نظم قرآن کے استعمال کو جاننا یہ بھی چار قسمیں ہیں حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ۔ اوران سب کے بعد بھی ایک مستقل قسم ہے جوسب کو شامل ہے یہ بھی چار ہیں۔ ماخذ اشتقاق کو جاننا ان کے مفاہیم اصطلاحیہ کو جاننا، اوران کی ترکیب کو جاننا اوران پر مرتب ہونے والے احکام کو جاننا۔ امر کے متعلق پر جاننا ضروری ہے کہ کہاں وجوب کے لیے ہے اور کہاں جواز کیلئے اور استحباب کے لیے اور تکرار کے لیے قرآن پاک میں لفظ ''ادا'' کبھی خفاء کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ''خفا'' ادا کے معنی میں آتا ہے نیز امر کبھی مطلق ہوتا ہے اور کبھی مقید۔ امر مقید کی چار قسمیں ہیں یہ سب امور اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں، ہم نے یہ نورالانوار سے مختصر نقل کیے ہیں۔ ابوداؤد شریف (بذل ۱۹۱) میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ تمہارے بعد فتنوں کا زمانہ آنے والا ہے کہ مال کی کثرت ہوجائے گی اور قرآن عام ہوجائے گا حتی کہ اس کو مؤمن اور منافق، مرد، عورت، بڑا، چھوٹا، غلام، آزاد سب پڑھنے لگیں گے تو ایک کہنے والا کہے گا کہ لوگ میرا اتباع کیوں نہ کرتے۔ حالانکہ میں نے قرآن پڑھا ہے۔ یہ اس وقت تک میری اتباع نہیں کریں گے کہ جب تک میں کوئی نئی بات نہ گھڑوں، حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ اپنے کونئی نئی بدعتوں سے بچائے رکھو کیونکہ جو بدعت نکالی جائے گی وہ گمراہی ہوگی۔ فقط

جو لوگ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے دنیا میں قرآن کو پھیلا دیا وہ حدیث بالا کی روشنی میں موجب ہلاکت اور فساد ہے قرآن پاک کا ترجمہ برکت کے واسطے موجب برکت، لیکن مسائل کا استنباط علوم قرآن سے واقفیت کے بغیر ہرگز جائز نہیں تاوقتیکہ ان علوم سے واقفیت نہ ہو جن کا ذکر مفصل اوپر گزر چکا کہ احکام کو مستنبط کرنا ان علوم پر موقوف ہے جو اوپر گزرے، درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا گیا ہے یوتی الحکمة من یشاء الآیة اس سے مراد ہے قرآن کی معرفت اس کے ناسخ ومنسوخ، محکم متشابہ، مقدم ومؤخر، حلال وحرام اوراس کے امثال وغیرہ کو جاننا۔

❁ ❁ ❁

مطالعہ کیوں... کیا... اور کیسے؟؟؟

از:　مولوی فاروق اعظم عاجز قاسمی
متعلّم دارالعلوم دیوبند

ایک شہسوار قلم کے لیے مطالعہ اتنا ضروری ہے جتنا انسانی زندگی کی بقاء کے لیے دانا اور پانی کی ضرورت ہے، مطالعہ کے بغیر قلم کے میدان میں ایک قدم بھی بڑھانا بہت مشکل ہے، علم انسان کا امتیاز ہی نہیں؛ بلکہ اس کی بنیادی ضرورت بھی ہے، جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ یہی مطالعہ ہے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے معاشرہ کی تعمیر وترقی کا فریضہ بھی اہم ہے؛ اس لیے مطالعہ ہماری سماجی ضرورت بھی ہے۔ اگر انسان اپنے اسکول و مدرسہ کی تعلیم مکمل کرکے اسی پر اکتفا کرکے بیٹھ جائے تو اس کے فکر ونظر کا دائرہ بالکل تنگ ہوکر رہ جائے گا۔ مطالعہ استعداد کی کنجی اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا بہترین آلہ ہے۔ یہ مطالعہ ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اپنی معلومات میں وسعت پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور زاویہٴ فکر ونظر کو وسیع سے وسیع تر کرتا رہتا ہے۔

مطالعہ ایک ایسا دوربین ہے جس کے ذریعے انسان دنیا کے گوشہ گوشہ کو دیکھتا رہتا ہے، مطالعہ ایک طیارے کی مانند ہے جس پر سوار ہوکر ایک مطالعہ کرنے والا دنیا کے چپہ چپہ کی سیر کرتا رہتا ہے اور وہاں کی تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی احوال سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ شورش نے کہا: ”کسی مقرر کا بلا مطالعہ تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسا بہار کے بغیر بسنت منانا، یا لو، میں پتنگ اڑانا“ (۱) یہ تو ایک مقرر کے سلسلے میں بات تھی؛ لیکن ٹھیک یہی صورت ایک قلم کار کی بھی ہے۔ مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب فرماتے ہیں: ”آج لوگ لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہوگئے جس کے نتیجے میں تحریر کی اثر آفرینی ختم ہوگئی؛ اس لیے تحریر کو موثر بنانے کے لیے ضرورت ہے کہ ایک صفحہ کو لکھنے کے لیے سو صفحات کا مطالعہ ہو“ (۲) پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں: ”مطالعہ کی غرض علم کا حصول اور راہ عمل کی تلاش ہے“ (۳)

شیشی کے اندر اگر مشک ہو تو کھولنے کے بعد خوشبو ضرور پھیلتی ہے اسی طرح جب ایک قلمکار کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہوتا ہے تو اس کی تحریر میں قوت اور اثر ہوتا ہے؛ ورنہ تحریر کمزور، پھسپھسی اور بے جان ہوتی ہے۔

عربی کا ایک مشہور محاورہ ہے: ''زمانے کا بہترین دوست کتاب ہے'' اسی کو شورش مرحوم نے اس طرح کہا ہے: ''کتاب سا مخلص دوست کوئی نہیں''۔ اسی طرح ایک مفکر کہتا ہے: ''کتابوں کا مطالعہ انسان کی شخصیت کو ارتقاء کی بلند منزلوں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ، حصول علم ومعلومات کا وسیلہ اور عملی تجرباتی سرمایہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے اور ذہن وفکر کو روشنی فراہم کرنے کا معروف ذریعہ ہے۔'' (۴)

کتابوں سے جہاں معلومات میں اضافہ اور راہ عمل کی جستجو ہوتی ہے وہیں اس کا مطالعہ ذوق میں بالیدگی، طبیعت میں نشاط، نگاہوں میں تیزی اور ذہن ودماغ کو تازگی بھی بخشتا ہے۔

مطالعہ کن کتابوں کا ہو؟

مطالعہ ایسی کتابوں کا ہو جو نگاہوں کو بلند، سخن کو دل نواز اور جاں کو پرسوز بنادے، اگر مطالعہ فکر کی سلامت روی، علم میں گیرائی اور عزائم میں پختگی کے ساتھ ساتھ فرحت بخش اور بہار آفریں بھی ہو تو اسے صحیح معنوں میں مطالعہ کہا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا دور انتہائی ترقی پذیر اور مسابقہ کا دور ہے، ذرائع ابلاغ وترسیل کی بہتات ہے، اور سہولیات کی بھی کمی نہیں ہے؛ ایسے ہی طرح طرح کے اخبارات ورسائل اور کتابوں کی بھی فراوانیاں ہیں۔ اب ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کتابوں کی اس ریل پیل اور جنگل میں کن کا مطالعہ کیا جائے اور کن کو چھوڑا جائے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ یہ ممکن نہیں؛ اس لیے کہ نہ ہر کتاب قابل مطالعہ ہے اور نہ ہی تمام کتابوں کے مطالعہ کرنے کی انسانی زندگی میں گنجائش۔ اس لیے انتہائی چھان پھٹک کر کتابوں کا انتخاب ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی انتہائی ضروری ہے کہ کتاب ایمان سوز اور اخلاق سوز نہ ہو؛ اس لیے کہ مطالعہ ہی کے غلط رخ نے عبدالماجد کو ارتداد کے گڈھے میں دھکیل دیا تھا؛ لیکن بعد میں اسی شخص کے مطالعہ کی سمت جب درست ہوئی تو عبدالماجد مولانا عبدالماجد ہوگئے اور مفسر قرآن اس شخص کے نام کا جزو لاینفک بن گیا؛ صحت مند مواد اور مستند مصنّفین کی کتابوں کے مطالعہ ہی کا کرشمہ کہنا چاہیے کہ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ (نومسلم)

دس بارہ سال ہی کی عمر میں اسلام کی طرف مائل ہوگئے تھے۔اسلیے معتبر و مستند مصنّفین ہی کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں مولانا یعقوبؒ کے حوالہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ شاہ ولی اللہؒ کا ایک مقولہ نقل کرتے ہیں: ''جب کسی کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کروتو پہلے اس کے نام کو دیکھو، اگر نام ہی اصل مضمون کے مناسب نہ ہوتو اس کو چھوڑ دو، پھر تمہید کو دیکھو، اگر وہ کتاب کے مضمون کے مناسب نہیں ہےتو چھوڑ دو،اس کے مطالعہ میں وقت ضائع نہ کرو، جب نام اور تمہید میں مناسبت دیکھ لوتب آگے بڑھو۔''(۵)

اس سلسلے میں ایسے اساتذہ کی رہنمائی بھی بڑی کارآمد ہوتی ہے جن پر مطالعہ کرنے والے کو مکمل اعتماد ہو، رہنما ایسا ہونا چاہیے جو بذات خود ہر اعتبار سے ایک پیاسے کی تشنہ لبی کو دور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو۔ مفکر اسلام ممتاز عالم دین مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں: ''مطالعہ وسیع کیجیے! اوراس کے لیے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی الاصلاح سے اوران اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے،ان سے مشورہ لیجیے''۔(۶) اسی طرح اس پگڈنڈی پر انتہائی سبک روی سے چلنے کی ضرورت ہے۔ مولانا ندویؒ مزید فرماتے ہیں: ''یہ ایک پل صراط ہےاس پر سبک روی اور بہت احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے''۔(۷) یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے عظیم شخص کو حضور ﷺ نے توریت جیسی عظیم المرتبت، آسمانی کتاب کے مطالعہ سے منع فرمادیا تھا۔

مطالعہ کے بنیادی مواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ندوی کہتے ہیں: ''مطالعہ میں ہدایت نبوی کے مطابق سب سے اچھی چیزیں لے لیں اور بری چیزیں چھوڑ دیں، اس میں انصاف سے کام لیں کہ یہی خیر کا دروازہ ہے''۔(۸) ایسے ہی انسانی زندگی کے محدود ہونے کی وجہ سے تمام موضوعات کا احاطہ مشکل ہے؛ البتہ ہر موضوع سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے۔ چناں چہ نعیم صدیقی صاحب رقم طراز ہیں: ''بنیادی طور پر قرآن وحدیث اوران سے متعلق علوم پر جس حد تک ممکن ہو نگاہ ہونی چاہیے...پھر حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت اور صحابہؓ کے سیر پر نظر ہونی چاہیے...ضروری ہے مطالعہ کا سفر کرنے والا ہر شخص کم از کم اپنے ملک اور اپنی قوم؛ بلکہ اپنی تہذیب کے ادبیات سے واقف ہو''۔(۹) جس طرح کتابوں کے انتخاب کا مرحلہ بڑا نازک ہے اسی طرح مطالعہ میں ترتیب کی رعایت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے،اس لیے مطالعہ کے معیار کو بتدریج بڑھایا جائے، ایسا نہ ہو کہ نورانی قاعدہ تو پڑھی نہیں اور قرآن شریف ہی پڑھنا شروع کردیا۔

طریقۂ کار

مطالعہ ایک خوبصورت گلشن کی مانند ہے، اس میں خوشبو بھی ہے، دل آویزی بھی ہے، اور خاردار شاخیں بھی ہیں۔ ایک طرف جہاں مطالعہ کی اہمیت مسلم اور افادیت قابل ذکر ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے مواد میں انتہائی چاق و چوبندی ناگزیر ہے۔ اسی طرح اس کے طریقہ کار سے بھی واقفیت بہت ہی ضروری ہے؛ اس لیے کہ کسی بھی کام کو اگر اس کے اصول وضابطہ سے کیا جائے تو وہ کارآمد ثابت ہوتا ہے؛ ورنہ نفع تو درکنار نقصان ضرور ہاتھ آتا ہے، فرض کیجیے! آپ کے پاس وقت بھی ہے، کتابیں بھی اچھی ہیں؛ لیکن ذہن پریشان، آنکھوں میں درد اور روشنی بھی مدھم تو آپ مطالعہ نہیں کرسکتے، اگر اسی صورت حال میں مطالعہ کی کوشش کریں گے تو صحت پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لیے صحت کا خیال بھی بہت ضروری ہے، بطور خاص آنکھوں کا خیال۔

یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ اس خیال سے مطالعہ کو ہرگز ترک نہیں کرنا چاہئے کہ یاد نہیں رہتا؛ بلکہ مطالعہ ضرور کرے کہیں نہ کہیں اس کا فائدہ ضرور ظاہر ہوتا ہے؛ اس لیے کہ مہندی میں سرخی پتھر پر بار بار گھسنے کے بعد ہی آتی ہے۔ مولانا عبدالسلام خاں لکھتے ہیں: ''مطالعہ جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی جلد محفوظ ہوگا اور تیز ہوگا؛ اس لیے کتب بینی کو سست روی یا یاد نہ رہنے کی وجہ سے ترک نہ کرنا چاہئے۔''

حاصل مطالعہ

مطالعہ کے ساتھ ساتھ حاصل مطالعہ کو ذہن نشین کرنے کی تدبیر بھی ضروری ہے۔ علم ومعلومات کی مثال ایک شکار کی سی ہے؛ لہٰذا اسے فوراً قابو میں کرنا چاہیے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''علم ایک شکار کی مانند ہے کتابت کے ذریعے اسے قید کرلو''۔ اس لیے مطالعہ کے دوران قلم کاپی لے کر خاص خاص باتوں کو نوٹ کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے؛ ورنہ بعد میں ایک چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ نہیں ملتی ہے۔ اب یا تو سرے سے بات ہی ذہن سے نکل جاتی ہے یا یاد تو رہتی ہے لیکن حوالہ دماغ سے غائب ہوجاتا ہے، ڈاکٹر صمت جاوید کا کہنا ہے کہ: ''یاد رکھنے کے قابل بات ہمیں دوران مطالعہ معلوم کتابوں پر دوران مطالعہ اہم مقامات پر نشان لگانے اور کتاب کی پشت پر سادہ اوراق میں اہم نکات کے خلاصہ ہوا سے کاپی یا کسی کاغذ کے پرزے پر ہی نوٹ

کرلیں''۔اسی طرح ڈاکٹر احمد سجاد کہتے ہیں:''ذاتی حصے اور بعض صفحات کے نمبروں کو لکھنے کی عادت ہنوز قائم ہے''۔مطالعہ کے معاً بعد بعض کتابوں پر ذاتی تاثرات تبصرے بھی اختصار کے ساتھ لکھنے کی عادت ہے۔'' حاصل مطالعہ کیسے ذہن نشین ہو یہ بھی ایک اہم عنصر ہے۔اس سلسلے میں نعیم صدیقی رقم طراز ہیں:''میری ذہنی ساخت یوں بنی کہ میں حاصل مطالعہ کو دماغ میں ڈال دیتا اور میرے اندر اس پر غور و بحث کا ایک سلسلہ چلتے پھرتے،اٹھتے بیٹھتے،کھانا کھاتے جاری رہتا یہاں تک کہ اس کا مثبت یا منفی اثر میرے عالم خیال پر رہ جاتا''۔

معلوم ہوا کہ مطالعہ کے بعد حاصل مطالعہ کی بھی بڑی اہمیت ہے؛ ورنہ تو بات لاحاصل ہی رہے گی۔مطالعہ کے دوران جہاں اچھی کتابوں،خوشگوار فضا،مناسب مقام،موزوں روشنی اور وقت کی تنظیم ضروری ہے وہیں صحت کا بھی خاص خیال رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

حواشی:

(۱) فن خطابت،ص:۳۷۔
(۲) ایک تقریر سے ماخوذ۔
(۳) ماہنامہ رفیق منزل مطالعہ نمبر۔
(۴) رفیق منزل مطالعہ نمبر،ص:۱۰۔
(۵) ذاتی ڈائری،ص:۱۱۔
(۶) استاذ و شاگرد کے حقوق،ص:۸۷۔
(۷) پاجا سراغ زندگی،ص:۵۸۔
(۸) میرا مطالعہ،ص:۲۰۱،بحوالہ رہنمائے مطالعہ۔
(۹) میرا مطالعہ بحوالہ رہنمائے مطالعہ،میرا مطالعہ ص:۱۶۵۔

فطرت سے بغاوت کب تک؟

از: ڈاکٹر ایم. اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

نئی تہذیب اور نئے عالمی نظام کے دعویداروں نے دنیائے انسانیت کی تاریخ کے بھیانک ترین فسادات میں مبتلا کردیا ہے۔ یہ فساد عقیدہ کا بھی ہے اور عمل کا بھی۔ ہم نے دیکھا اس سال دنیا عظیم ترین غذائی اجناس کی کمی اور گرانی کے بحران سے گذر رہی ہے، غذائی اجناس کی کمیابی یا غلط استعمال نے انسانوں کے لیے اناج کی فراہمی مشکل کردی ہے۔ ان کی قیمتوں میں ایک سال میں 40-60% اضافہ ہوا، اور ابھی کمی کے امکان نہیں ہیں۔ معاشی کساد بازاری، مہنگائی اور بے روزگاری نے گلوبلائزیشن کے بلبلہ کی حقیقت عیاں کردی ہے۔ صارف کلچر (زیادہ سے زیادہ خرچ کرو) تہذیب کی بدولت انسان نے قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال کیا اور نتیجہ سامنے آیا عالمی حدت Global warming اور آلودگی کی متنوع اقسام کی تباہ کاریوں کی صورت میں، آج دنیا کی جو عمومی سماجی، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی صورت حال ہے اس کے لیے کون سے عوامل ذمہ دار ہیں؟ کیا اِن عوامل پر غور کرکے صورت حال کے سدھار کا وقت نہیں آیا ہے۔ الٹا یوں محسوس ہورہا ہے کہ جیسے اس دنیا کے بڑے یا دنیا کو کنٹرول کرنے والوں کا گروہ مسلسل منظّم انداز میں ہر طرح کی تباہی کی طرف لے جانے پر آمادہ ہے۔

اقوام متحدہ اور اس سے جڑے اداروں کے بارے میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ کم سے کم عالمی رائے عامہ کے اظہار کا اسٹیج تو ہے ہی اگرچہ فیصلہ وہاں وہی ہوتے ہیں جو عموماً ایک مخصوص استعمار پسند ذہن چاہتا ہے۔ پچھلے دنوں اقوامِ متحدہ سے دو خبریں ایسی آئی ہیں جن سے موٹے طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی اداروں کے ذریعہ دنیا کو کس طرح اخلاقی گراوٹ کی انتہا تک پہنچانے کی سازش پر عمل ہورہا ہے۔ پہلی خبر میں بتایا گیا ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہم جنس پرستی کی

حمایت میں فرانس اور ہالینڈ نے تحریک پیش کی کہ ہم جنس پرستی کو حق سمجھا جائے اور اِسے جرائم کی فہرست سے نکال دیا جائے۔اس قرارداد کے حق میں ۶۶ ممالک نے دستخط کردیے۔فوری طور پر شامی ممبر نے اس تحریک کے خلاف تحریک پیش کردی انہیں بھی (۶۰) ممالک کی حمایت حاصل تھی۔(رائٹر ۱۹/۱۲/۲۰۰۸ء)

دوسری خبر میں بتایا گیا ہے کہ جینوا میں اظہارِ رائے کی آزادی کے ماہرین نے کہا ہے کہ اقوام متحدہ کو ان قراردادوں کو منظور کرنا بند کردینا چاہیے جنھیں مسلم ممالک پیش کرتے ہیں جن میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ''مذہب کی توہین کرنے کے خلاف قانون بنائیں'' اِن ماہرین کا کہنا ہے کہ ان قوانین کا مقصد مذہبی لیڈروں کو تنقید سے بچانا اور مذہبی اقلیتوں اور مذہب نہ ماننے والوں کو کچلنا ہے۔ان ماہرین کا یہ بھی فرمان ہے کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور انسانی حقوق کونسل کو آئندہ ایسے ریزولیشن پاس نہیں کرنے چاہئیں جن میں مذہب کی توہین کی بات کی جاتی ہو۔ (رائٹر ۱۷/۱۲/۲۰۰۸ء)

مذکورہ بالا دونوں کوششوں کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے کہ عالمی انسانی سماج کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں عالمی انسانی برادری کو کس تہذیب کی طرف لے جانا چاہتی ہیں۔آزادیٔ اظہارِ رائے کی آڑ میں تنقیص، تضحیک اور تمسخر کو اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف روا رکھا جاتا ہے۔یہ دنیا جانتی ہے کہ اسلام کبھی بھی افہام وتفہیم، بحث ومباحثہ، مجادلۂ احسن سے بھاگتا نہیں ہے۔اسلام عقلی اور منطقی دلائل کا قائل ہے۔قرآن پاک میں ہر چوتھی پانچویں آیت میں کسی نہ کسی طور پر استدلال کیا گیا ہے۔اور عقل ومنطق کے استعمال پر ابھارا گیا ہے مگر یہاں جو آزادی چاہی جارہی ہے وہ بے قید مادر پدر آزاد ہے۔اس میں علمی نکات سے بحث نہیں ہے عقلی ومنطقی استدلال کی گنجائش نہیں ہے۔کارٹون بنانا، جھوٹے الزامات لگانا، حقائق کو توڑ مروڑ کر کردارکشی کرنا کس طرح آزادی رائے کے ضمرہ میں آسکتا ہے؟ پھر کیا آزادی کے یہ دیوانے بتاسکتے ہیں کہ آج 9/11 کے بعد کی دنیا میں کتنی آزادی میسر ہے؟ کیا دیگر معاملات میں بھی اسی طرح کی مطلق آزادی دی جارہی ہے؟ مثال کے طور پر آج قومی مفاد کے نام پر انسانوں کی آزادیاں محدود نہیں کردی گئی ہیں؟ 9/11 کے بعد کی دنیا میں جس طرح سخت ترین قوانین بنائے گئے ہیں یا آج ماحولیاتی آلودگی سے نپٹنے کے لیے جس طرح سخت فیصلہ کرنے کے منصوبہ بنائے جارہے ہیں یا امریکی مالیاتی اور بینکنگ نظام کے بحران کے بعد بے قید مطلق آزاد نظام کے بجائے جس طرح سرکاری

کنٹرول کو بڑھایا جارہا ہے کیا وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ کوئی بھی آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ انسانی آزادی کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ انسانی سماج کچھ حدود وقیود کا پابند ہو۔ عملاً آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس سماج کو جو اقدار Values عزیز ہیں وہ اس کے لیے ''مقدس گائے'' Holy cow کا درجہ رکھتا ہے۔ کہیں ملک کا جھنڈا، ملک کا گانا، قومی ہیرو، مقامی روایت یا قدریں ایسی بنادی گئی ہیں کہ کوئی بھی اس کے خلاف عمل نہیں کرسکتا۔ جھنڈا الٹا ہوگیا، گرگیا، قومی گیت کے دوران کھڑا نہیں ہوا تو پھر کیا آزادی کا حق باقی رہ جاتا ہے؟ کیا یہ کھلی منافقت نہیں ہے کہ کچھ اداروں یا علامتوں کو آپ تنقید سے بالاتر سمجھیں تو بھی آپ آزادی پسند کہلائیں اور دوسرے لوگ کچھ دیگر اشخاص یا علامتوں کا مضحکہ اڑانے سے روکیں تو وہ نکّو بنا کر غیر مہذب بتائے جائیں۔

دوسری خبر کے سلسلہ میں عرض ہے کہ ہم جنس پرستی جیسی شیطانی حرکت کے لئے آزادی کا مطالبہ خود اس بات کا اظہار ہے کہ آزادی کے نام پر دنیا کو کس بربادی کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ ایسے وقت میں جب دنیا پہلے ہی ایڈس جیسے تا حال ناقابل علاج مرض سے جوجھ رہی ہے جو خطا کاروں کے ساتھ معصوموں کو بھی نگل رہا ہے دوسری طرف اس مرض کو بڑھانے کے لیے جو ممکن ہوسکتا ہے وہ بھی کیا جارہا ہے۔ پورے انسانی سماج کو یہ آزادی کس طرح تباہ و برباد کردے گی اسے صرف سوچ کر بھی وحشت ہوتی ہے۔ جب مرد، مرد اور خاتون - خاتون کی شادی ہوگی تو نئی نسل کیسے چلے گی؟ اس کا اندازہ اس مثال سے لگائیں کہ ایک اسرائیلی ہم جنس جوڑے (مرد مرد) نے ممبئی میں اپنے نطفہ کو کسی کرائے کی ماں کے رحم میں پرورش کرا کر اسے گود لیا ہے اور اس کی پرورش کررہے ہیں۔ اب اس بچہ کا باپ کون ہوگا؟ ماں کون ہوگی؟ باپ کی جائداد کا وارث کون ہوگا؟ وغیرہ نت نئے مسائل جو کھڑے ہونگے وہ معاشرہ کی بنیادوں کو جڑوں سے ہلا کر برباد کردیں گے۔ ہمارے ملک میں بھی مفاد عامہ کی ایک درخواست دہلی کی عدالت میں زیر سماعت ہے جس میں حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس فعل کو جرائم کی فہرست سے نکال کر باقاعدہ اس کو منظور کرے۔ محکمہ صحت کے وزیر امبونی رام داس اس کے حمایتی ہیں مگر وزارت داخلہ راضی نہیں ہے۔ اب ماحول یہ بنادیا گیا ہے کہ اس شیطانی فعل کی حمایت کرنے والے آزاد خیال، مہذب اور ترقی پسند مانے جارہے ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والے کٹر، جنونی اور پرانے خیالات کے بتائے جارہے ہیں۔

اگر دنیا انسانیت خصوصاً اس کے بڑے اس دنیا کو مسائل اور بحرانوں سے پاک کر کے امن، انصاف، ترقی، خوشحالی کا ماحول بنانا چاہتے ہیں تو سب کو تحفظات اور تعصّبات سے اوپر اٹھ کر مسائل کی واقعی رہنمائی کی طرف دیکھنا ہوگا۔ جیسے ابھی عالمی اقتصادی اور مالی بحران کے حل کے ضمن میں سود کی شرح کم کر کے اسے تقریباً صفر پر لے آیا گیا ہے۔ دنیا بھر میں مالیاتی ادارہ شرح سود کم کر کے مندی کے اثرات کو کم کرنا چاہ رہے ہیں ہمارے ملک میں بھی سرکار اور ریزرو بینک لگاتار ایسا ہی کر رہے ہیں۔ کانگریس کے ترجمان اور ممبر پارلیمنٹ ابھیشک سنگھوی نے اپنے مضمون (Profit for all) سب کا فائدہ میں اسلامی اقتصادی نظام اپنانے کی صلاح دی ہے۔ انھوں نے اس نظام کی جو خصوصیات بتائی ہیں اس میں:

(۱) سود سے پاک ہونا۔

(۲) حصہ داری ہونا۔

(۳) محنت اور سرمایہ کی برابری ہونا۔

کا خاص ذکر کیا ہے۔ موصوف نے یہ بھی بتایا ہے کہ خلیجی علاقہ کے مالیاتی ادارہ کیونکہ انہیں اصولوں پر چلائے جاتے ہیں اس لئے وہ موجودہ بحران کو زیادہ جھیل پارہے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے دس مضبوط ترین مالیاتی اداروں میں ہوتا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۸/۱۱/۲۰۰۸ء)

کیا دنیا کے دیگر تمام مسائل بھی اِسی الٰہی رہنمائی سے حل نہیں کیے جاسکتے؟

سہ روزہ تحفظ ختم نبوت تربیتی کیمپ ویک روزہ کانفرنس

جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ سپول، بہار

زیرنگرانی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

از: مفتی جاوید اختر مظاہری
صدر المدرسین جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول

۱۹ تا ۲۱ر نومبر ۲۰۰۸ء تک نو نشستوں پر مشتمل تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر سہ روزہ تربیتی کیمپ زیرنگرانی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند اور زیراہتمام جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، ضلع سپول منعقد ہوا۔ ہر نشست کی صدارت وقیادت عظیم المرتبت شخصیات نے کی۔

پہلی نشست منعقدہ ۱۹ر نومبر ۲۰۰۸ء

تربیتی کیمپ کی پہلی اور افتتاحی نشست ۱۹ر نومبر ۲۰۰۸ء بروز بدھ بعد نماز فجر منعقد ہوئی جس کی صدارت حضرت مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری، نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند نے فرمائی اور حضرت مولانا مفتی محمد مشتاق احمد صاحت قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند مہمان خصوصی تھے۔ تلاوت قرآن اور نعت کے بعد حضرت الحاج مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب دامت برکاتہم بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، سپول نے تربیتی کیمپ کے تقاضہ وضرورت پر مفصل روشنی ڈالی۔ آپ نے بتایا کہ جب سے ہمارے مسلم اکثریتی ضلع سپول کی باگ ڈور ضلع مجسٹریٹ، شریف عالم قادیانی نے سنبھالی ہے اس کے سرکاری اثر ورسوخ سے مرعوب ہوکر بہت سے عوام تو عوام، اس علاقہ کے بعض

مولوی، اور قوم کے ذمہ دار کہلانے والے سماجی لیڈران بھی فتنۂ قادیانیت میں مکمل گرفتار ہوچکے ہیں۔ ان حالات میں تقاضا تھا کہ اس فتنہ کے سد باب کے لیے کوئی موثر عملی اقدام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے مشورے سے جامعۃ القاسم نے تربیتی کیمپ کا بیڑا اٹھایا ہے تاکہ فتنہ کی سرکوبی کے ساتھ ساتھ عوام وخواص میں اس کے خلاف موثر بیداری پیدا کی جاسکے۔ الحمدللہ آج اس کی پہلی نشست میں ہم اور آپ شریک ہیں۔ نیز تمام سامعین سے یہ عہد کرایا کہ ضرورت پڑی تو جان، مال قربان کیے جاسکتے ہیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ سپول کا مسلمان اپنے پیارے نبی ﷺ کا جاہ وجلال دے دیں۔ انشاء اللہ ہمیں قادیانیت کو اس کی اصل بنیاد وجڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔

مفتی صاحب موصوف کے بعد، حضرت مولانا صغیر احمد صاحب رحمانی، رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ وسابق استاذ حدیث جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر نے تفصیل سے علاقے کے حالات کو بیان کیا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کا نام بھی شمار کرایا جو فتنۂ قادیانیت میں ملوث ہوچکے تھے اور ان کا تعلق قادیانی ڈی ایم سے تھا۔

نشست کے اخیر میں حضرت مولانا شاہ عالم گورکھپوری دامت برکاتہم نے اپنے افتتاحی وکلیدی خطبہ میں تربیتی کیمپ کے اصول وضوابط اور اس کے مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ آپ نے بتایا کہ کل ہند مجلس کا قیام ۱۹۸۶ء میں عمل میں آیا تھا اس کے تحت منعقد کیے جانے والے تربیتی کیمپوں کی ایک کامیاب کڑی آج کی یہ نشست بھی ہے۔ انشاء اللہ یہ کیمپ ضلع سپول کے قادیانیوں کی تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا۔ یہ نشست ۱۲؍بجے حضرت موصوف ہی کی دعا پر اختتام پذیر ہوئی۔

عصر اور مغرب کے درمیان سوال وجواب کی مجلس رہی جس میں حضرت مولانا شاہ عالم صاحب نے حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے موضوع کے تعلق سے کوئی بھی سوال کوئی بھی شخص پوچھ سکتا تھا۔ ماشاء اللہ یہ مجلس اہل علم حضرات کے لیے نہایت مفید وکارآمد رہی۔

دوسری نشست منعقدہ ۱۹؍نومبر ۲۰۰۸ء

بعد نماز مغرب متصلاً تربیتی کیمپ کی دوسری نشست کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید اور نعت

پاک سے ہوا۔ اس نشست کی صدارت لندن کی معروف علمی شخصیت، حضرت مولانا محمد یعقوب منشی قاسمی صاحب زیدمجدہ، صدر مجلس تحقیقات شرعیہ ڈیوز بری برطانیہ، نے فرمائی اور صوبہ گجرات کے معروف وممتاز بزرگ حضرت مولانا مفتی احمد دیولا صاحب مدظلہ مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر ضلع بھروچ گجرات، مہمان خصوصی تھے۔

اس نشست میں حضرت مولانا شاہ عالم قاسمی صاحب کا ردقادیانیت کے موضوع پر باضابطہ تربیتی بیان شروع ہوا۔ تین سو سے زائد علماء آپ کے درس میں شریک رہے۔ آپ نے اپنے مخصوص اور دلچسپ لب ولہجے میں فرمایا کہ مرزا قادیانی کی متناقض عبارات جواس کی کتابوں میں موجود ہیں وہ خوداس کی تردید کے لیے کافی ہیں۔ مرزا قادیانی کی تحریروں سے واضح کیا کہ قادیانیت کوئی مذہب نہیں بلکہ فتنہ ہے اوراس کے لیے اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

بعدہٗ حضرت مولانا عبداللہ صاحب بخاری امام وخطیب جامع مسجد مونگیر نے مختصراً اس موضوع پر خطاب فرمایا پھر حضرت مولانا نسیم احمد مظاہری شیخ الحدیث جامعہ عربیہ نورالاسلام میرٹھ نے حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری دامت برکاتہم خلیفہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ارسال کردہ پیغام سنایا۔

جامعۃ القاسم کی دینی خدمات اور حضرت الحاج مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب کی کامیاب محنت اور ملکی وملی خدمات پر حضرت مولانا مفتی احمد دیولا مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر بھروچ گجرات نے خوشی اور مسرت اور بھرپور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یقیناً جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی ضلع سپول، بہار کا وہ ممتاز ادارہ ہے جس نے اپنے علاقہ اور قوم کی ہر موڑ پر رہنمائی کی ہے اور ضلالت وگمراہی سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کی ایک تازہ جھلک آج کا یہ سہ روزہ تربیتی کیمپ تحفظ ختم نبوت اور کانفرنس ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد احسان احمد صاحب قاسمی نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کا ارسال کردہ تحفظ ختم نبوت کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ پھر اخیر میں حضرت مولانا یعقوب منشی صاحب قاسمی صدر

مجلس تحقیقات شرعیہ برطانیہ نے اپنی بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ نے ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لیے جوقدم اٹھایا ہے اوراس میں وہ صد فیصد کامیاب ہیں اور جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ یہاں کے اساتذہ اورطلبہ سہ روزہ تربیتی کیمپ تحفظ ختم نبوت کانفرنس کے کامیابی کی دلیل کے لیے کافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی محفوظ عثمانی صاحب کوایسے کاموں کے لیے قبول فرمائے اور ہم سب کو ہر طرح کے تعاون کی توفیق عطا فرمائے۔ اخیر میں آپ ہی کی دعا پر شب میں ۱۱ر بجے اس نشست کا اختتام ہوا۔

تیسری نشست ۲۰ر نومبر ۲۰۰۸ء

تربیتی کیمپ کی تیسری نشست ۲۰ر نومبر بروز جمعرات، بعدنماز فجر متصلاً ۶ تا ۸ر بجے زیرصدارت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا صغیراحمد صاحب رحمانی رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اورسابق استاذ حدیث جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر منعقد ہوئی۔ اورالمعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے استاذ حضرت مولانا نورالحق صاحب رحمانی مہمانِ خصوصی رہے۔ تلاوت قرآن مجید ونعت پاک کے بعد حضرت مولانا محمد راشد صاحب قاسمی ناظم شعبۂ تحفظ ختم نبوت جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کا خطاب ہوا جس میں آپ نے نزول عیسیٰؑ پر بڑی تفصیلی گفتگو فرمائی اوراخیر میں آپ کی دعا پر نشست کا اختتام ہوا۔

چوتھی نشست ۲۰ر نومبر ۲۰۰۸ء

ناشتہ کے بعد تربیتی پروگرام کی چوتھی نشست کا آغاز ٹھیک ۹ر بجے تلاوت قرآن مجید و نعت پاک سے ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا نورالحق صاحب رحمانی استاذ المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے فرمائی۔ اس نشست میں حضرت مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری کا تفصیلی تربیتی خطاب ہوا جس سے علماء مدارس، ائمہ مساجد اورتمام شرکاءِ تربیتی کیمپ کی اس موضوع پر ہمہ جہت تشنگی دور ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یقیناً اس موضوع پر جن خوبیوں سے نوازا ہے تمام ہی علماء نے برملاء اس کا اعتراف کیا۔ ایک بجے پھر آپ ہی کی دعا پر نشست کا اختتام ہوا۔

عصر ومغرب کے مابین حسب سابق سوالات وجوابات کی مجلس ہوئی جس میں جناب مولانا راشد صاحب گورکھپوری استاذ شعبۂ تحفظ ختم نبوت مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور حضرت مولانا صغیر احمد صاحب رحمانی تھے۔

پانچویں نشست ۲۰/نومبر ۲۰۰۸ء

تربیتی پروگرام کی پانچویں نشست کا بعد نماز مغرب آغاز ہوا۔ اس نشست کی صدارت حضرت مولانا محمد خالد صاحب غازی پوری استاذ حدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ، معتمد ونمائندہ مدبر اسلام حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے صدارت فرمائی۔ حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند مہمان خصوصی رہے۔ تلاوت ونعت کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد مشتاق احمد صاحب قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند نے والدین کے حقوق، علماء کا ادب اور حصول علم کی فضیلت پر سیر حاصل خطاب فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا نورالحق صاحب رحمانی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے اپنے خطاب میں زور دیا کہ بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا بہت ہی ضروری ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ اسکول کی تعلیم نہیں دی جائے بلکہ ہر شخص اپنے بچے کو دینی و مذہبی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم بھی دے۔ موصوف کے بعد جناب مولانا اشتیاق احمد صاحب مبلغ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند نے کذبات مرزا کے عنوان پر بیان فرمایا۔

اخیر میں حضرت مولانا محمد خالد صاحب ندوی دامت برکاتہم استاذ حدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے کلیدی خطبہ سے قبل حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا پیغام سنایا اور آپ ہی کی دعا پر ۱۰/بجے شب نشست کا اختتام ہوا۔

چھٹی نشست ۲۱/نومبر ۲۰۰۸ء

تربیتی پروگرام کی چھٹی نشست ۲۱/نومبر ۲۰۰۸ء کا آغاز یوم الجمعہ بعد نماز فجر تلاوت ونعت سے ہوا۔ حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری سابق نائب مہتمم

دارالعلوم دیوبند وناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند دہلی نے اس نشست کی صدارت فرمائی اور حضرت مولانا عبدالمتین صاحب رحمانی مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ گڑھیا نرپت گنج ضلع اررپہ، کا شعلہ انگیز خطاب ہوا۔ آپ نے امت کو للکارتے ہوئے فرمایا کہ ایمان کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کے بعد حضرت قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری کے بدست سند شرکت سہ روزہ تربیتی کیمپ اور بدست حضرت الحاج مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی شرکاء کے درمیان اس موضوع کی اہم کتابیں بیگ کے ساتھ تقسیم کی گئیں اور حضرت قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہ کی دعا پر ۸؍بجے اس نشست کا اختتام ہوا۔

ساتویں نشست ۲۱؍نومبر ۲۰۰۸ء

ناشتہ کے بعد اجلاس عام ہوا جس کی صدارت حضرت قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند نے فرمائی۔ تلاوت ونعت کے بعد مختلف علماء کرام کا بیان ہوا۔ تحفظ ختم نبوت کے پروانہ، جناب ایم پی علی انور صاحب نے اپنے ولولہ انگیز بیان میں فرمایا کہ انشاء اللہ فتنۂ قادیانیت کو ہم جڑ سے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے بس آپ لوگوں کا تعاون ہمارے ساتھ رہے، ہم سب کچھ برداشت کرسکتے ہیں لیکن یہ نہیں برداشت کرسکتے کہ ہمارے نبی ﷺ کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔ بعدہٗ حضرت قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کا تفصیلی خطاب ہوا۔ تربیتی پروگرام میں شریک مختلف اضلاع کے ذمہ دار علماء نے اپنے اپنے تاثرات بھی تحریراً و تقریراً پیش کیے۔ اخیر میں حضرت قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری کی دعاء سے قبل استاذ العلماء حضرت مولانا صغیر احمد صاحب رحمانی مدظلہ نے اوّلاً علاقہ کی خطرناک صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد آپ نے تربیتی کیمپ کے تعلق سے اپنے تاثرات ظاہر کیے اور بھرپور اطمینان کا بھی اظہار فرمایا۔ آپ نے اپنے بیان میں بجا طور پر یہ فرمایا کہ ہمارا مطالعہ اس موضوع پر ایک عرصہ سے ہے اور خانقاہ رحمانی میں رہتے ہوئے اس موضوع پر بہت کچھ کام بھی کیا ہے لیکن اس تربیتی کیمپ میں شرکت اور بطور خاص حضرت مولانا شاہ عالم

گورکھپوری مدظلہ کے بیانات سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کتابوں سے بہت مشکل ہیں۔ آپ کے بیانات اس موضوع پر گرہ کشا اور ماشاء اللہ تشفی بخش ہوتے ہیں۔ موصوف نے دارالعلوم دیوبند کے اس طریقہ کار اور رجال کار و افراد سازی کے بامعنی حکمت عملی کو بھی خوب خوب سراہا۔ اس کے بعد حضرت نے تجاویز پیش فرمائیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

❁ ❁ ❁

تجاویز، سہ روزہ تربیتی کیمپ و یک روزہ تحفظ ختم نبوت کانفرنس

منعقدہ: ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۲۰۰۸ء

بمقام: جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، سپول

باہتمام: حضرت الحاج مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی و مہتمم

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، سپول

---

(۱) اس عظیم اجلاس کے ذریعہ اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کے ہر فرد سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ قادیانی فتنہ کے خلاف جہاں کہیں بھی ہو اٹھ کھڑا ہو اور اپنی تمام تر کوششیں اس فتنہ کو فرو کرنے میں لگادے۔

(۲) علاقہ کوسی کے تمام باشندگان ماضی قریب میں سابق ڈی ایم سپول کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں کی پرزور الفاظ میں مذمت کرتے ہیں، اس طرح کی گھناؤنی حرکتیں ملک کے آئین و دستور کے خلاف ہیں، لاکھوں کی تعداد میں شریک فرزندان توحید حکومت وقت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس فتنہ انگیز ڈی ایم کو پبلک سیکٹر سے دور رکھتے ہوئے قانونی نوٹس لے اور اس کی اصلاح کرے یا اسے معطل کرے۔

(۳) ہم تمام باشندگان کوسی کمشنری و پورنیہ کمشنری، ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کی زیرنگرانی جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، سپول میں قائم سہ روزہ تربیتی کیمپ اور تحفظ ختم نبوت کانفرنس کے انعقاد پر اراکین جامعہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور قدم بقدم انہیں اپنے ہر تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔

(۴) یہ اجلاس تمام ذمہ داران مدارس سے اپیل کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے مدرسوں میں تحفظ ختم نبوت کا شعبہ قائم کریں اور ذمہ داران وائمہ مساجد سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں تحفظ ختم نبوت کے کاموں کو بڑھاوا دیں اور مقامی مدرسوں میں قائم شعبہ نیز دارالعلوم دیوبند کی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت سے رابطہ کریں۔

(۵) یہ اجلاس اپیل کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا ہرفرد ردقادیانیت کے موضوع پر لٹریچر کی توسیع و اشاعت میں بھرپور حصہ لیں اور اپنے اپنے علاقوں میں رد قادیانیت کے لیٹریچر طبع کرواکے تقسیم کرائے۔ اخیر میں شرکاء تحفظ ختم نبوت کانفرنس کا شکریہ مولانا محمودالحسن ایوبی ناظم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول نے ادا کیا۔

داڑھی کے بارے میں مرکزی حکومت کا بیان دین میں مداخلت

شریعت کی تشریح کا حق صرف مستند علماء اسلام کو حاصل ہے۔

مولانا مرغوب الرحمن مہتمم دارالعلوم دیوبند

دیوبند، داڑھی رکھنے کے بارے میں مرکزی حکومت نے سپریم کورٹ میں جو جواب داخل کیا ہے وہ دین میں صریح مداخلت اور مذہبی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہے، جو دستور ہند کی کھلی خلاف ورزی ہے، ان خیالات کا اظہار دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے کیا۔ مولانا موصوف، آفتاب احمد انصاری کو افسران کے ذریعہ داڑھی رکھنے سے روکے جانے کے بعد سپریم کورٹ میں دائر پٹیشن پر مرکزی حکومت کی جانب سے داخل عدالت کی گئی وضاحت پر اظہار خیال کر رہے تھے۔

مولانا موصوف نے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ داڑھی رکھنا اسلام میں ایک ضروری عمل ہے، جس کی حیثیت شعائر اسلام کی ہے۔ اگر کوئی داڑھی نہیں رکھتا تو وہ گنہگار ہے، اور اسلام کے ایک عظیم شعار سے محروم ہے، ایسے اہم شعار سے مسلمانوں کو روکنا، حکومت کا غیر دستوری عمل ہے۔

جہاں تک احکام شرعیہ میں درجہ بندی کا معاملہ ہے اس کی تشریح علماء اسلام کا کام ہے، حکومت اس کی مجاز نہیں ہے، لہٰذا دارالعلوم حکومت کی وضاحت کو مسترد کرتا ہے۔ پھر یہ کہ ایک مثالی مسلمان بننے کے لیے تو فرض اور واجب کے ساتھ سنت بلکہ مستحب پر بھی عمل کرنا پڑتا ہے، اس لیے اگر حکومت داڑھی کے صرف سنت ہونے کا اعتراف کرتی ہے تو بھی وہ سنت پر عمل سے روکنے کا حق نہیں رکھتی، دستور ہند نے ہر شہری کو مذہبی آزادی کی جو ضمانت دی ہے، داڑھی سے روکنا اس کی خلاف ورزی اور مسلمانوں کو ان کے ایک بنیادی حق سے محروم کرنے کی ناروا کوشش ہے۔ کیا حکومت ہند کسی سکھ افسر کو اس کی ہیئت بدلنے کے لیے کہہ سکتی ہے؟ داڑھی رکھنا اسلامی شریعت میں مسلمانوں کی شناخت کے طور پر اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ سکھوں میں داڑھی رکھنا، اور ہندوؤں میں چوٹی رکھنا اور جنیو پہننا۔

مولانا موصوف نے وزیر اعظم سے اپیل کی کہ وہ ذاتی طور پر اس مسئلہ میں دلچسپی لیں اور سپریم کورٹ میں ایسا غیر ذمہ دارانہ اور فتنہ انگیز بیان کرنے والے افسران کے خلاف فوری کارروائی کریں جس سے خود حکومت کی شبیہ کو نقصان پہنچنا یقینی ہے۔ نیز یہ بھی ملحوظ رکھیں کہ سابق میں اس طرح کے کئی واقعات میں مؤقر عدالتوں نے داڑھی رکھنے کی اجازت نہ روکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جاری کردہ: دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند